معالم القرآن

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

ادارۂ تعلیماتِ قرآن

سیالکوٹ، پاکستان

بچہ کی ماں اور اُجرت کا مطالبہ

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اگر بچہ کی ماں دُودھ پلانے کی اُجرت کا مطالبہ کرتی ہے تو جب تک اس کے نکاح میں ہے یا طلاق کی عدّت میں ہے اسے اُجرت کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔ نان ونفقہ جو شوہر کے ذمہ ہے وہی کافی ہے مزید اُجرت کا مطالبہ باپ کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ ہاں عدّت گزر جانے پر وہ بچہ کے باپ سے اُجرت مانگ سکتی ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔

یتیم بچہ کو دُودھ پلانا

۶۸۳۔ اور وارث پر بھی عورت کا کھانا کپڑا اسی طرح ہے یعنی اگر باپ مر جاوے تو بچہ کے وارثوں پر بھی یہی لازم ہے کہ دُودھ پلانے کی مدّت میں اس کی ماں کے کھانے کپڑے کا خرچ اٹھائیں اور تکلیف نہ پہنچائیں اور وارث سے مراد وہ وارث ہے جو عورت کا محرم بھی ہو[1]

اصل ارشاد وعلی الوارث مثل ذالک ہے اور وارث پر اسی جیسا ہے۔ اس میں دو باتیں تنقیح طلب ہیں۔ وارث سے کون مراد ہے اور "اسی کا" اشارا آیت میں کس طرف ہے

وارث کی حد تک آئمہ قانون کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام مالک وارث سے باپ کا وارث مراد لیتے ہیں اور وہ خود دُودھ پینے والا بچہ ہے اور مطلب یہ بتاتے ہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد بچہ کے اخراجات کی پابجائی بچہ کے مال میں سے کی جائے گی۔ اور امام احمد، امام ابوحنیفہ وارث سے خود بچہ کا وارث مراد لیتے ہیں۔ یعنی اگر بچہ مر جائے تو جو اُس بچہ کے وارث شرعاً ہوں گے ان پر بچہ کے ان اخراجات کی ذمہ داری ہوگی جو بچہ کے باپ پر تھی لیکن امام ابوحنیفہ یہ شرط لگاتے ہیں کہ وہ وارث ہونے کے ساتھ محرم بھی ہو۔ اور محرم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس بچہ اور اس کے وارث میں ایسا رشتہ ہو کہ اگر دونوں میں سے ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت فرض کر لیا جائے تو دونوں میں ازدواجی

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

تعلق حرام ہو مثلاً بھائی، چچا، دادا، بہن، ماں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلوانے کا انتظام اس شخص کی ذمہ داری ہے جو بچہ کا جائز وارث اور محرم ہو۔ اگر ایسے وارث ایک سے زیادہ ہوں تو ہر ایک پر بقدرِ میراث ذمہ داری تقسیم ہو گی۔

نابالغ بچہ کی کفالت

اسی سے امام اعظم نے عملی زندگی کا یہ قانون بھی معلوم کیا ہے کہ نابالغ یتیم بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری دودھ چھڑانے کے بعد وارثوں پر ہو گی۔ کیونکہ دودھ کو درجہ مقصودیت حاصل نہیں مقصد تو بچہ کی پرورش اور تربیت ہے۔ اس لیے تربیت کی ساری ضروریات کی ذمہ داری وارثوں پر ہو گی۔ اگر بچہ کے ماں اور دادا دونوں زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچہ کے محرم بھی ہیں اور وارث بھی۔ اس لیے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدرِ میراث ہو گا۔ یعنی ایک تہائی ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہو گا۔[1]

نادار رشتہ داروں کی کفالت

امام ابوحنیفہ نے اسی آیت سے یہ قانونی نکتہ بھی معلوم کیا ہے کہ شیر خوار بچہ کی کفالت جو دوسروں پر واجب کی گئی ہے اس کی علت یہی ہے کہ بچہ بذاتِ خود چھٹپنے کی وجہ سے اپنی پرورش کے لیے دوسروں کا محتاج ہے۔ احتیاج اور ضرورت مندی کے اشتراک علت سے محتاج عورتوں، اپاہج مردوں اور نابالغ بچوں کے مصارف ان رشتہ داروں کے ذمہ ہیں۔ صاحب ابن رقمطراز ہیں کہ یہی حضرت فاروق اعظم اور جمہور سلف کی رائے ہے۔ ابن قدامہ نے امام احمد کی بھی یہی رائے لکھی ہے کہ فرد پر ہر اس رشتہ دار کی کفالت واجب ہے جس کے مرنے پر وہ اس کا وارث ہو سکتا ہو۔ امام احمد نے اس رائے کے حق میں قرآن حکیم کی اسی آیت سے استدلال کیا ہے جس میں وارث کو نفقہ کے وجوب کا سبب بتایا ہے۔ اس طور سے امام احمد کے نزدیک ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، پوتے، نواسے وغیرہ صلبی رشتہ داروں کے علاوہ بھائی، بہن، چچا زاد بہنیں، پھوپھی، بھتیجی وغیرہ کی کفالت بھی واجب ہو گی۔ لیکن امام

---

[1] معارف القرآن

Marfat.com

ابو حنیفہ کے نزدیک مذکورہ بالا صلبی رشتہ داروں کے علاوہ صرف ان اعزّہ کی کفالت واجب ہو گی جن سے فرد کوئی رحمی قرابت رکھتا ہو اور جن کا وہ محرم ہو۔ اس بنیاد پر چچازاد بھائی کا نفقہ واجب نہ ہو گا۔ امام صاحب کے نزدیک اصول اور فروع کے علاوہ باقی رشتہ داروں میں کفالت کا مدار رحمی قرابت ہے نہ کہ وراثت۔

اگر ایک نادار فرد کے نفقہ کے متعدد ذمّہ دار موجود ہوں تو یہ ذمّہ داری ان میں کس طرح تقسیم کی جائے۔ اس کے بارے میں فقہا کے درمیان خاصا اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک قابلِ ترجیح وہ رائے ہے جو علامہ کاشانی نے بدائع الصنائع میں اختیار کی ہے۔ یعنی ہر محتاج فرد کی کفالت کی ذمّہ داری اس کے وارثوں پر ان کے حصہ وراثت کی نسبت سے تقسیم کر دی جائے گی۔ یہی امام احمد کی رائے ہے۔

دوسری تنقیح طلب بات اس آیت میں مثل ذالک کا اشارا ہے۔ اصل میں اس ارشاد وعلی الوارث مثل ذالک کا پیوند ترکیبی وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف سے ہے۔ درمیان کے دو فقرے دو ضمنی باتوں کو سمجھانے کے لیے آتے ہیں۔ لفظ ذالک عربی زبان میں اشارۂ بعید کے لیے آتا ہے تو اس کا مشار الیہ اس کے قریب نہیں اس سے دور ہونا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے بچّہ کی خوراک و پوشاک کی ذمّہ داری والد پر ہے۔ اسی طرح والد کے مر جانے کے بعد بچّہ کے وارث پر ہے۔ بعض علماء نے ذالک کا اشارہ قریب یعنی لاتضار والدۃ کے مضمون جملہ کو قرار دیا ہے یعنی جیسے والد کی طرح وارث کو بھی نقصان نہ پہنچایا جائے لیکن اس میں کوئی معنویت نہیں ہے کیونکہ نقصان نہ پہنچانے میں وارث کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ بہر حال اس آیت میں ہماری عملی زندگی کے لیے یہ قانون بتایا گیا ہے کہ اگر بچّہ کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہٖ یہی پوزیشن مذکورہ ذمّہ داریوں اور حقوق کی پابجائی میں بچّہ کے وارث کی ہو گی۔

بچّہ کا دُودھ چھڑانا

۶۸۴ - پھر اگر والدین باہمی رضامندی اور صلاح و مشورے سے دُودھ چھڑانا چاہیں تو اُن پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یعنی اگر ماں باپ کسی مصلحت کی وجہ سے دو سال کے اندر ہی بچّہ کی مصلحت کا لحاظ کر کے باہمی مشورہ و رضامندی سے دُودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں

Marfat.com

کوئی گناہ نہیں ہے مثلاً ماں کا دُودھ اچھا نہ ہو[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر بچے کے والدین رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کرلیں کہ بچہ کی شیر خوارگی کی مدّت یعنی دو سال سے کم میں ہی دُودھ چھڑا دیں خواہ ماں کی معذوری کی وجہ سے ایسا کیا جائے یا بچہ کی کسی بیماری کے پیشِ نظر ایسا کیا جائے تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں[2] گویا بتا دیا کہ مدّت میں کمی کی گنجائش ہے۔ یہ ایسی تحدید نہیں کہ اس سے نیچے آنا ناجائز ہو۔ کیونکہ قرآن نے پہلی آیت میں حولین کاملین فرما دیا تھا۔ کاملین سے یہ بات مفہوم ہو رہی ہے کہ شاید ایک روز بھی کمی روا نہیں ہے۔ اس لیے فرمایا کہ حولین سے پہلے اگر کوئی دُودھ چھڑانا چاہے تو کوئی حرج نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کمال کا مرجع زیادت ہے یعنی اس سے زیادہ اگر پلایا گیا تو یہ جائز نہیں ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے علامہ نسفی کے اس موقف پر بھرپور تنقید کی ہے کہ اس آیت میں توسیع کی طرف اشارا ہے اور مطلب یہ ہے کہ دو سال سے زیادہ یا کم میں کوئی دُودھ چھڑانا چاہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ایسا ہو تو پھر دو سال کی تحدید میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ دراصل ابو حنیفہ کا دُودھ پلانے کی مدّت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کے نزدیک بھی دو سال ہیں بلکہ اختلاف اس میں ہے کہ بچہ نے دو سال ۴ ماہ کی عمر میں اگر کسی عورت کا دُودھ پی لیا تو رضاعت ثابت ہو گی یا نہیں۔ ابو حنیفہ حملہ وفصالہ ثلاثون شھرا کی وجہ سے حُرمت کے قائل ہیں۔ صاحبِ دُرِ مختار رقمطراز ہیں الخلاف فی التحریم اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ اپنی جگہ آئے گی۔

۶۸۵۔ اور اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو دُودھ پلواؤ تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ جو کچھ اُن کو دینا کیا تھا دستور کے مطابق ان کے حوالہ کر دو۔ یعنی اے مرد اگر تم کسی ضرورت اور مصلحت سے ماں کے سوا کسی دوسری عورت سے دُودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے مگر اس کی وجہ سے ماں کا کوئی حق نہ روکا جائے اور نہ کاٹا جائے بلکہ دستور کے مطابق جو کچھ ماں کو دینا ٹھہرایا تھا وہ دے دو اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دُودھ پلانے والی کا حق نہ کاٹے[3]۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ تم

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] معارف القرآن [3] افاداتِ شیخ الہند

اپنی اولاد کو ماں کی بجائے کسی انا سے دُودھ پلوانا چاہو تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ جو کچھ تم نے انا کو دینا کیا ہو وہ اس کو دستور کے مطابق دے دو۔ اور یا یہ کہ بشرطیکہ اُن کے حقوق کی پابجائی میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور اس کا نان ونفقہ وغیرہ جو کچھ دینا تھا وہ قاعدے کے مطابق بچہ کی ماں کو دے دو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ماں کا حق قاعدے کے مطابق ادا کرو۔ بعض حضرات نے بالمعروف کو اتیتم کے متعلق کیا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جو ماں کو دستور کے مطابق دینا کیا تھا یعنی معروف سے مراد یہ ہے کہ معاملہ صاف کرو۔ وہ کھانے کپڑے پر تمہارے بچے کو دُودھ پلائے گی یا تنخواہ لے گی یا دونوں۔ اور اگر تنخواہ لے گی تو کیا لے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دُودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچہ کے لیے نقصان دہ ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دُودھ پلانے سے روکے اور کسی انا سے پلوائے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے، اس سے معاملہ تنخواہ کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔ اور وقت مقررہ پر یہ اُجرت اس کے سپرد کر دے [1]

آیت کے آخر میں رضاعت کے سارے قانون کو تقویٰ الٰہی سے مربوط کر دیا ہے۔ یہ ایک عمیق اور لطیف شعور ہے کہ اس کے بغیر ان احکام کی رُوح تک رسائی ممکن نہیں ہے اور نہ بغیر تقویٰ کے ان کی پابجائی ہو سکتی ہے کیونکہ تقویٰ ہی ہر معاملے میں بس کی گانٹھ ہے۔ یعنی ان احکام پر پوری طرح کاربند ہو جاؤ کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔ اور اس یقین کے ساتھ عمل کے میدان میں قدم رکھو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے اعمال کے ایک ایک گوشہ کو دیکھ رہا ہے اور اس کے نتیجے میں تمہارا ایک ایک عمل درج رجسٹر ہو رہا ہے۔ وقت آرہا ہے کہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا ملے گی۔ اگر تم یہاں حقوق کی پابجائی کرو گے اور اولاد کے معاملے میں خانگی زندگی باہمی مشاورت اور رضامندی سے چلاؤ گے اور مضرتوں سے دامن بچا کر رکھو گے تو اللہ تعالیٰ دُنیا میں تمہاری اولاد کو تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک، دلوں کی مسرت وشادمانی کا سامان بنائے گا اور آخرت میں تمہارے لیے یہ ثواب اور اجر و جزا کا ذریعہ ہوں گے۔

---

[1] معارف القرآن

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو اُن کو چاہیے کہ چار ماہ دس روز تک عدّت وفات میں اپنے آپ کو روکے رکھیں[۶۸۶]۔ پھر جب وہ یہ مدّت پوری کر لیں تو (انہیں اپنے معاملے کا اختیار ہے) وہ جو کچھ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں۔ اس کا تم پر کوئی الزام نہیں ہے[۶۸۷]۔ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ کو اس کی پوری خبر ہے[۶۸۸]۔

بیوہ کی عدّت

دُنیا کے عمرانی اور معاشرتی مسائل میں وفات کے بعد بیوہ کا مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ بیوہ کے ساتھ دُنیا کے کسی دوسرے مذہب نے کوئی خاص توجہ نہیں کی بلکہ بعض مذہبوں نے تو بیوہ کو زندہ رہنے کے حق ہی سے محروم کر دیا۔ اسلام نے بیوہ کو زندہ رہنے پوری طرح زندہ رہنے کا سہاگنوں ہی کی طرح زندہ رہنے کا حق عطا کیا ہے۔ اور یہ باب بھی

Marfat.com

جہاں تک دُنیوی برکتوں کا تعلق ہے اسلام کا ایک روشن ترین باب ہے۔ اسلام سے پہلے وہ عورت جس کا شوہر مرجاتا رسوم و رواج کی انتہائی سختیاں گوارا کرتی تھی۔ خود عربوں میں یہ رواج تھا کہ وہ بیوہ عورت کو ایک پرانے گھر میں بُری حالت میں بٹھا دیتے۔ اور ایک سال تک اسے خوشبو لگانے یا اچھے کپڑے پہننے کی اجازت نہ دیتے۔ جب سال پورا ہوجاتا تو اسے بہت سی جاہلی رسمیں پوری کرنی پڑتیں۔ کبھی وہ اونٹنی کی مینگنیاں پھینکتی اور کہیں اسے گدھے اور بکری پر سوار کیا جاتا۔ جب اسلام آیا تو اس نے عورت کے جسم ناتواں سے یہ سارا بوجھ اتار دیا۔ اور اس کو شوہر کی محرومی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں سے بچالیا اور اسے شائستہ اور مطمئن زندگی گزارنے کے حقوق عنایت کیے۔

۶۸۶۔ اور جو لوگ تم میں سے وفات پاجائیں اور اپنے پیچھے بیوی چھوڑ جائیں تو اُن کو چاہیے کہ چار ماہ دس روز تک عدّتِ وفات میں اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ طلاق کی عدّت میں تین حیض انتظار کرے۔ اب فرمایا کہ موت کی عدّت میں چار مہینے دس دن انتظار کرے۔ اس مدّت میں اگر معلوم ہوگیا کہ عورت کو حمل نہیں تو عورت کو نکاح کی اجازت ہوگی ورنہ وضع حمل کے بعد اجازت ہوگی۔ اس کی تشریح سورۂ طلاق میں آئے گی۔ حقیقت میں تین حیض یا چار مہینے دس دن حمل کے انتظار اور اس کے دریافت کرنے کے لیے مقرر فرمائے۔[1]

یہ عدّتِ وفات ان عورتوں کے لیے بھی ہے جن سے شوہروں کی خلوت صحیح نہ ہوئی ہو۔ البتہ حاملہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی عدّتِ وفات وضع حمل تک ہے، خواہ وضع حمل شوہر کی وفات کے بعد ہی ہوجائے یا اس میں کئی مہینے صرف ہوں۔[2]

مطلقہ عورت کی عدّت میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کی عدّت کی بڑی وجہ استبراء رحم ہے۔ تاکہ حمل کا معاملہ صاف ہوجائے اور نسب میں کسی قسم کی غلطی واقع نہ ہو۔ یہاں بھی یہی مقصود ہے۔ نیز یہ عدّت اس غم اور افسوس کو بھی شامل ہے جو خاوند کے مرجانے سے عورت کو پیش آتا ہے اور نکاح جیسی نعمت کے چھن جانے سے جو صدمہ ہوتا ہے

---

[1] افادات شیخ الہند [2] تفہیم القرآن

Marfat.com

اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی عورت جو اللہ پر ایمان رکھتی ہے اور قیامت کے دن کا یقین رکھتی ہے اس کو یہ حلال نہیں ہے کہ وہ کسی مُردے پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے سوائے اپنے شوہر کے کہ اس پر چار ماہ دس روز سوگوار رہے۔ اگرچہ نکاح کی نعمت سے محرومی تو طلاق میں بھی ہوتی ہے لیکن طلاق میں میاں بیوی کو کچھ نہ کچھ دخل ہوتا ہے اور موت کی وجہ سے جو نعمت سلب ہوتی ہے اس میں کسی کو بھی دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے یہاں عدت کی میعاد طلاق کی مدت سے زیادہ کر دی۔ اور چونکہ طلاق میں خاوند زندہ ہوتا ہے اس لیے استبرا ورحم کے لیے تین حیض رکھے اور یہاں چونکہ خاوند موجود نہیں ہے جو استبراء ورحم کے معاملہ میں ایک واقف کار اور رازدان فریق ہوتا ہے۔ اس لیے عدت کی میعاد میں اضافہ کر دیا۔ اور چونکہ اس عدت میں استبراء کے ساتھ عورت کے سوگ کی بھی رعایت ہے اس لیے سوائے حاملہ کے ہر بیوہ کے لیے یہ عدت مقرر کی ہے چاہے وہ صغیرہ ہو یا اس سے خلوت نہ ہوئی ہو۔ حاملہ کی بحث انشاء اللہ سورۂ طلاق میں آئے گی۔

عدت میں احداد کا حکم

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی ملک ہوتی تھی۔ وہ جس طرح چاہتا اس سے معاملہ کرتا۔ عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو نہ پیش کر سکا۔ ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت ہی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اب اس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مرجانا چاہیے۔ اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دُنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گزارے۔ عربوں کا رواج پہلے پڑھ چکے ہو۔ اسلام آیا تو اس مظلوم کی فریاد رسی ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانے کو محدود کر دیا۔ یعنی چار ماہ دس روز اور صرف اسی مدت میں یہ حکم دیا کہ اس مدت میں بناؤ سنگار نہ کریں جیسے خوشبو لگانا، مہندی لگانا، سرمہ لگانا، زیور پہننا، رنگے ہوئے کپڑے پہننا، اس کو احداد کہتے ہیں۔ احداد کے معنے لغت میں روک دینے کے ہیں۔ اسی سے دربان کو حداد کہتے ہیں کیونکہ وہ اندر آنے سے روکتا ہے

Marfat.com

اور اسی لیے سزا کو حد کہتے ہیں کیونکہ وہ گناہ سے روکتی ہے اسی بنا پر امام اعظم کے نزدیک حدود کی حیثیت گناہوں کے لیے زواجر کی ہے کوافر کی نہیں ہے۔ علامہ ابن درستویہ فرماتے ہیں۔ احداد کے معنے یہاں عدت والی عورت کا اپنے کو زینت، بناؤ سنوار اور ازدواجی تعلق کے پیغام سے روکنے کے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت اُم سلمہ کے حوالہ سے حضرت اُم حبیبہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بر سر منبر یہ بات سنی ہے کہ کسی عورت کے لیے جو اللہ پر ایمان اور قیامت کے دن پر یقین رکھتی ہو تین دن سے زیادہ سوگ جائز نہیں ہے ہاں شوہر پر وہ چار ماہ دس روز سوگ کر سکتی ہے۔

اور بخاری و مسلم میں حضرت اُم عطیہ کے حوالہ سے آتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ کرے ہاں بیوی اپنے شوہر کے مرنے پر چار ماہ دس روز سوگ کرنے کی مجاز ہے۔ وہ نہ رنگین کپڑے پہنے لیکن یمنی چادریں اس میں داخل نہیں ہیں اور نہ سُرمہ لگائے اور نہ خوشبو لگائے۔

الغرض بناؤ سنگار کرنا، خوشبو لگانا، مہندی لگانا، سُرمہ لگانا، زیور پہننا، رنگے ہوئے کپڑے پہننا، بلا ضرورت گھر سے نکلنا یہ سب باتیں اجمالاً حرام ہیں۔ اور عدت میں جو باتیں بیوہ کو ممنوع ہیں وہی باتیں اس عورت کو بھی منع ہیں جسے طلاق بائنہ ملی ہو۔ یہ امام ابوحنیفہ ابوعبید، ابوثور اور کچھ مالکیہ اور کچھ شوافع کا مذہب ہے۔ نیز یہ حکم چھوٹی بچی اور غیر مسلم عورت کا نہیں ہے یعنی ان پر احداد نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۃ طلاق میں ملے گی اپنے آپ کو روکے رکھیں سے یہاں مراد صرف یہی نہیں کہ وہ اس مدت میں نکاح نہ کریں بلکہ اس سے مراد اپنے آپ کو ان باتوں سے بھی روکنا ہے جن کا ذکر پڑھ چکے ہو۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا اس زمانے میں عورت گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت اُم سلمہ، حضرت سعید بن المسیب، حضرت ابراہیم نخعی اور آئمہ اربعہ اس کے قائل ہیں کہ زمانہ عدت میں عورت کو اسی گھر میں رہنا چاہیے جہاں اس کے شوہر نے وفات پائی ہے دن کے وقت کسی ضرورت سے وہ باہر جا سکتی ہے مگر رات کو قیام اسی گھر میں ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس حضرت عائشہ ابن عباس، حضرت علی، حضرت جابر، حضرت

Marfat.com

حضرت طاؤس، حضرت حسن بصری، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور تمام اہلِ ظاہر اس بات کے قائل ہیں کہ عورت اپنی عدّت کا زمانہ جہاں چاہے گزار سکتی ہے۔ اور اس زمانے میں سفر بھی کر سکتی ہے [1]

چار مہینے دس روز کا مطلب یہ ہے کہ ایک سو تیس دن کی عدّت ہے۔ مگر ہاں اگر کسی عورت کا شوہر چاند رات کے دن مرا تو پھر چاند کے حساب سے عدّت پوری کی جائے خواہ کوئی چاند انتیس کا ہو یا تیس کا۔ لیکن اگر چاند رات کو نہیں مرا تو پھر ایک سو تیس دن پورے کرنے ہوں گے۔ عدّت ختم ہونے کا وقت وہی ہو گا جو شوہر کے انتقال کا وقت ہے۔

۶۸۷۔ پھر جب وہ یہ عدّت پوری کر لیں تو وہ جو کچھ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ یعنی جب بیوہ عورتیں اپنی عدّت پوری کر لیں یعنی غیر حاملہ چار ماہ دس روز اور حاملہ مدّتِ حمل تو ان کو دستورِ شریعت کے مطابق نکاح کر لینے میں کوئی گناہ نہیں اور زینت و خوشبو سب حلال ہیں۔ [2]

مطلب یہ ہے کہ عدّت گزار چکنے کے بعد وہ آزاد ہیں کہ اپنے معاملہ میں دستور کے مطابق جو قدم مناسب خیال کریں اٹھائیں۔ اس کے بعد نہ اولیا پر کوئی الزام ہے اور نہ اُن پر کوئی گناہ ہے۔ اگر انہوں نے معروف کے کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے مطلب یہ ہے کہ غیر شرعی رسموں کو شریعت کا درجہ دے کر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو مطعون نہ بنانا چاہیے نہ شوہر کے وارثوں اور اولیا کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ عورت اپنے شوہر کا پورا سوگ بھی نہ منا سکی کہ وہ اس سے تنگ آ گئے اور نہ عورت کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ ابھی شوہر کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ یہ شادی رچانے بیٹھ گئی۔ اللہ نے جو حدود مقرر کر دیے ہیں بس ان کی پابندی کرنی چاہیے۔ [3]

آیت زیرِ بحث میں بالمعروف کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاح شرعی طریق سے کریں نکاح صحیح کریں، مہر مناسب ہو، رشتہ کفو میں ہو، تو کسی کو ان کے اختیارِ تمیزی اور صوابدید پر قدغن لگانے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون نے ایک بالغہ عورت کو جو حق دیا ہے اگر وہ اسے شرعی طریقہ کے مطابق استعمال کریں تو

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الہند [3] تدبر قرآن

Marfat.com

کسی کو روکنے اور دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ اس حق کو ضابطۂ شریعت کے خلاف استعمال کرے۔ مثلاً جس سے نکاح حرام ہے وہ اس سے نکاح کرنے لگے یا بغیر گواہوں کے نکاح کرے تو بے شک عدالت کو عورت کے سرپرستوں کو بلکہ ہر مسلمان کو حسبِ استطاعت روکنے کا حق ہے۔ گویا اس طرح اسلام نے بیوہ عورت کو دوسری شادی کی اجازت دے کر اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کو ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع قمع کر دیا اور اس کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا حصہ بنا دیا۔ اور جس سوسائٹی سے اُسے اوروں نے نکال دیا ہے اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا پروانہ دیا اور جس مہر و عنایت سے وہ محروم ہو چکی ہے وہ اس کو پھر عطا کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بیواؤں کی امداد فرمائی اور گیارہ شادیوں میں سے ۹ شادیاں بیوہ عورتوں سے کی ہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت حفصہ، حضرت زینب، حضرت اُم سلمہ، حضرت اُم حبیبہ، حضرت جویریہ، حضرت میمونہ، حضرت صفیہ بیوہ تھیں جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا۔ اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

> بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا اور ایسا ہے جیسا دن بھر روزہ رکھنے والا اور شب بھر اللہ کی جناب میں قیام کرنے والا۔ (صحیح بخاری کتاب الآداب)

۶۸۸ - اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ کو اس کی پوری خبر ہے۔ یعنی اللہ تمہارے عمل کی باریکیوں سے آشنا ہے۔ اس پر کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ اس لیے سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ تمہاری قدموں کی لغزش تمہاری معاشرت کو خراب کرے گی۔ تم خواہ عصر جدید میں ارتقاء کی کتنی منزلیں طے کر جاؤ اور علوم و فنون میں خواہ کیسے ہی درجہ کمال کمال کو پہنچ جاؤ تمہیں اپنی عملی زندگی میں سے معاشرتی اصلاح کے ان اجتماعی قوانین سے بے پروا نہ ہونا چاہیے جو سینۂ قرآن سے اُبل کر تمہارے سامنے آئے ہیں۔ رُسوم و عادات کی اصلاح صرف قرآن سے بستگی میں ہے۔ اسی سے تمہارے اعمال میں اصلاح آئے گی اور اس کے نتیجے میں تم دُنیا میں خوشحال اور آخرت میں شادماں ہو گے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ
فِي أَنْفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ
سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ
النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي
أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾ ع

جن بیوہ عورتوں سے تم نکاح کرنا چاہو اشارے اور کنائے میں اپنا خیال ان تک پہنچا دو یا اپنے جی میں نکاح کا ارادہ پوشیدہ رکھو۔ دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔[٦٨٩] اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تمہارے دل میں ضرور آئے گا۔[٦٩٠] لیکن خفیہ طور پر ان سے نکاح کا وعدہ نہ لو۔ ہاں اگر کوئی بات کہنی ہے تو دستور کے طریقے سے کہو اور عقدِ نکاح باندھنے کا اس وقت تک ارادہ نہ کرو جب تک عدت پوری نہ ہو جائے[٦٩١] اور یقین کرو کہ جو کچھ تمہارے اندر ہے اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ اس سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا اور بُردبار ہے۔

زمانۂ عدّت میں نکاح حرام ہے

اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے کے جذبات کے احترام کی بڑی اہمیت ہے۔ مسلمانوں کا معاشرہ رحماء بینھم کا معاشرہ ہے جانوروں کا گلہ نہیں ہے۔ یہ جذبات ہی کا احترام ہے کہ اگر کوئی انتقال کر جائے تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کی بیوہ سے اس کے زمانہ عدت ہی میں نکاح کی پینگیں بڑھانا شروع کر دے۔ اپنے ایک مرحوم بھائی کے لیے ایک حساس اور دردمند بھائی کے اندر جو جذبات ہونے چاہییں یہ بات اس کے منافی ہے۔ ایک غم زدہ بیوہ کے جذبات کا ایک شریف آدمی کو جو لحاظ ہونا چاہیے۔ یہ اس کے خلاف ہے اس لیے یہ موقعہ نئی ازدواجی زندگی کے بارے میں گفتگو کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس گفتگو سے بیوہ کے دل کو ٹھیس پہنچے اور اس کے زخموں کو ہرا کر دے۔ اللہ اکبر نازک مواقع پر جذبات کا یہ احترام قرآنی تعلیمات ہی کا حصہ ہے۔ بیوہ عورت شوہر کے سائے سے محروم ہو کر بے یار و مددگار اور بے مونس و غم خوار ہے۔ نہ اس کے کھانے پینے کا سہارا ہے، اللہ نے جسے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا اور اس کی ذمہ داری اس کے شوہر کے حوالے کر دی تھی۔ اب لاچار و بے بس ہے۔ اب غم و الم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر بجائے اس کے غم کو غلط کرنے کے حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلانے لگیں اور اس رفیق حیات کی جدائی کے فوراً بعد جس کے ساتھ اس کی زندگی کا سکون وابستہ تھا شادی کی بات کرنے بیٹھ جائیں یہ بہت بڑی بے حسی ہے۔

۶۸۹ - جن بیوہ عورتوں سے تم نکاح کرنا چاہو اشارے اور کنائے میں اپنا خیال ان تک پہنچاؤ یا اپنے جی میں نکاح کا ارادہ پوشیدہ رکھو۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یعنی عورت شوہر کے نکاح سے جدا ہوئی تو جب تک عدت میں ہے کسی دوسرے کو جائز نہیں ہے کہ اس سے نکاح کرے یا صاف وعدہ لے لے یا صاف پیغام بھیجے۔ لیکن اگر دل میں ارادہ رکھے کہ عدت کے بعد نکاح کروں گا یا اشارۃً اپنا مطلب اسے سنا دے تاکہ کوئی دوسرا اس سے پہلے پیغام نہ دے۔ مثلاً عورت کو سنا دے کہ مجھ کو ہر کوئی عزیز رکھے گا یا کہے میرا ارادہ کہیں شادی کرنے کا ہے تو کچھ گناہ نہیں لیکن صاف پیغام ہرگز نہ دے[1]

[1] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

اصل ارشاد ہیں فیما عرضتم بہ من خطبۃ النساء۔ عرضتم تعریض سے بنا ہے اور کسی شخص کو ایسے الفاظ میں اپنا مطلب سمجھانا جن الفاظ کے معنے مختلف ہوں۔

ایسے ذو معنے اور ذو مطالب الفاظ کے ساتھ اپنے مطلب کو سمجھانے اور بیان کرنے کو تعریض کہتے ہیں۔ تعریض تصریح کے مقابلے میں آتا ہے۔ تصریح کے معنے ہیں صاف الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرنا۔ علمائے بلاغت نے تعریض اور کنایہ میں فرق کیا ہے زمخشری اور تفتازانی نے اس پر بحث کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی دونوں جمع ہو جاتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے۔ مثلاً آپ کو کسی سے کچھ روپے لینے ہیں اور آپ اس کے پاس جائیں اور جا کر کہیں کہ سلام کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ یہ تعریض بھی ہے اور کنایہ بھی ہے اور اگر آپ کسی سخاوت جتانے کے لیے چولہوں میں راکھ کی بہنات بنائیں تو یہ کنایہ ہے تعریض نہیں ہے اور اگر آپ ایسے شخص کو مخاطب کر کے جس نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہو یہ کہیں کہ آپ نے مجھے تکلیف دی ہے آپ کو پتہ لگ جائے گا یہ تعریض ہے کنایہ نہیں ہے۔

تعریض کی مثالیں

سکینہ دختر حنظلہ کہتی ہیں کہ میں عدت میں تھی کہ میرے پاس محمد بن علی تشریف لائے اور یوں گویا ہوئے کہ آپ کو میرا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ اور میری حضرت علی سے جو قرابت ہے وہ بھی آپ جانتی ہیں۔ اور عرب میں میرا مقام بھی آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ سکینہ نے سن کر کہا اللہ آپ کو معاف کرے آپ زمانہ عدت میں رشتہ کی بات کر رہے ہیں۔ وہ بولے جی میں تو حضور انور اور علی سے اپنی قرابت آپ کو بتا رہا ہوں۔

حضرت ام سلمہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے رشتہ کرنا چاہتے تھے فرمایا:

> تم جانتی ہو کہ فرستادہ خدا ہوں، اللہ کی مخلوق میں سب سے برتر ہوں اور میرے خاندان میں میرا مقام بھی تم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بطور اشارا یوں کہہ سکتا ہے کہ میرا بھی شادی کا ارادہ ہے یا میری آرزو ہے کہ مجھے کوئی نیک بیوی مل جائے۔

Marfat.com

خطبہ یعنی رشتہ

خطبہ خاء کے زیر کے ساتھ کسی عمل سے یا کسی قول سے نکاح کی درخواست اور نکاح کے پیغام کو کہتے ہیں اور خطبہ خاء کے پیش کے ساتھ اس کلام کو کہتے ہیں جو پند و نصائح پر مشتمل ہو اور جس میں عام لوگوں کو خطاب کیا جائے۔ اُردو میں خطبہ خاء کے زیر کے ساتھ منگنی اور رشتہ کے معنے میں ہے۔ مسند احمد، سنن نسائی اور صحیح بخاری میں ہے:۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ منگنی کرے کوئی شخص دوسرے کی منگیتر سے یہاں تک کہ رشتہ کرنے والا رشتہ چھوڑ دے۔ یا اسے اجازت دے دے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کا خواہاں ہو تو وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کوئی کلمہ بطورِ اشارا زبان سے کہہ دے یا اپنے دل میں نکاح کا ارادہ کرے لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ پوشیدہ طور پر نکاح کا قول و قرار کرے۔ بس اس موقعہ پر تعزیت و ہمدردی تک بات محدود رہنی چاہیے۔ جو اس طرح کے حالات کے لیے معروف ہے۔

۶۹۰ - اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تمہارے دل میں ضرور آئے گی لیکن خفیہ طور پر ان سے نکاح کا وعدہ نہ ہو۔ ہاں اگر کوئی بات کہنی ہے۔ تو دستور کے مطابق کہو۔ دل میں ان کے خیال آنے کو ذکر کہا ہے۔ لیکن جو کچھ منع ہے وہ عدت میں عورت کو رشتہ دینا ہے۔ اگر تم وہاں جا کر رشتہ کا پیغام نہ دو بلکہ اپنی جگہ اس کا ذکر کرو۔ مثلاً اپنے گھر میں اپنے والدہ، والد، بھائی اور بہن سے ذکر کرو کہ عورت نیک ہے اگر وہاں رشتہ ہو جائے تو کیا خیال ہے اس طرح ذکر کرنے کی اجازت ہے اس لیے کہ یہ ایک فطری میلان ہے جو دراصل مباح اور جائز ہے صرف حالات کی بنا پر اس کے عملی اقدام میں تاخیر کی ہدایت کی گئی ہے کیونکہ اسلام فطری میلانات کو کچلتا نہیں ہے بلکہ انہیں مہذب اور شائستہ بناتا ہے۔ اسی طرح بشری انگیخت کو دبانے کے بجائے اسے اظہار کے مناسب مواقع فراہم کرتا ہے۔ اور اسی لیے اسلام ان باتوں سے روکتا ہے جو شعور کی پاکیزگی اور ضمیر کی طہارت کے خلاف ہوں۔ بہر حال اس قسم کے تذکرے اور ذکر و اذکار میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن پوشیدہ طور پر ان سے قول و قرار نہ لو۔ یعنی ارادہ کرنے

اشارہ کرنے اور گھر میں ذکر واذکار میں تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ بات مناسب نہیں ہے کہ عدت پوری ہونے سے پہلے پوشیدہ طور پر ان سے کوئی وعدہ لے لیا جائے کیونکہ یہ بات ادب کے خلاف ہے۔ اس میں اس کے مرحوم شوہر کی یادوں میں خیانت ہے۔ اور اس میں اللہ سبحانہ، سے حیا کی کمی ہے اس لیے کہ اللہ نے عدت کو ازدواجی زندگی کے دو معاہدوں کے درمیان بطور فصل مقرر کیا ہے۔ الا ان تقولوا قولا معروفا یعنی اس میں کوئی برائی نہیں کہ دستور کے مطابق کوئی بات کہہ دو۔ قول معروف سے وہی تعریض مراد ہے یعنی اشارے اور کنائے میں کچھ کہنے کی اجازت ہے۔ رہا عزم نکاح اور وہ بھی عدت میں حرام ہے۔ لا تعزموا عقدۃ النکاح، عزم کے معنے ہیں ارادے کا آخری درجہ جس کے بعد کام صادر ہو جاتا ہے۔ انسانی ارادے کے مختلف درجات میں سانح، خاطر، تفکر، ارادہ، ہمت اور عزم۔ عزم آخری درجہ کا نام ہے جو کام سے خاص جوڑ رکھتا ہے یعنی عزم کام کے بالکل متصل اور قریب ہوتا ہے۔ زیادتی احتیاط کی بنا پر یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ نکاح نہ کرو بلکہ فرمایا ہے کہ نکاح کا عزم بھی نہ کرو اور یہ تعبیر لطافت اور دقیق ہونے کے لحاظ سے تلک حدود اللہ فلا تقربوھا کے قریب قریب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عدت موت کی ہو یا طلاق بائن کی اس کے دوران کسی مرد کو یہ جائز نہیں ہے کہ صاف الفاظ میں عورت سے نکاح کی بات کرے یا اس سے کوئی وعدہ حاصل کرے یعنی تصریحاً پیغام دینا حرام ہے اور اشارۃً کہنا جائز ہے اور دل سے یہ ارادہ کرنا کہ عدت ہی میں اس سے نکاح کر لوں گا یہ حرام ہے اور دل میں یہ ارادہ کرنا کہ عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کر دوں گا جائز ہے۔ اور جو عورت رجعی طلاق کی عدت گزار رہی ہو تصریحاً اور تعریضاً دونوں طرح حرام ہے۔

۶۹۱ - اور یقین کرو کہ جو کچھ تمہارے اندر ہے اللہ خوب جانتا ہے۔ اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جی کی باتیں جانتا ہے لہٰذا ناجائز ارادے سے بچتے رہو۔ اور اگر ناجائز ارادہ ہو گیا تو اس سے توبہ کرو۔ اللہ بخشنے والا ہے۔ اور گنہگار کی اگر پکڑ نہ ہو تو اس سے مطمئن نہ ہو جائے کیونکہ وہ حلیم ہے سزا میں جلدی نہیں کرتا[1]۔ یہاں قانون بیان کرنے کے بعد خشیت الٰہی کی طرف متوجہ کیا ہے۔

[1] افادات شیخ الہند

Marfat.com

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا
لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَ
عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى
الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ
وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ
يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ
تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ
اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

اور اگر تم عورتوں کو اس[٦٩٢] صورت میں طلاق دو کہ نہ اُن کو ہاتھ لگایا ہو اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ البتہ ایسی صورت میں ان کو فائدہ پہنچاؤ مقدور والا اپنی حیثیت کے مطابق دے، تنگ دست اپنی حالت کے موافق، یہ فائدہ دستور کے مطابق ہونا چاہیے۔ نیک کردار لوگوں کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اور اگر ایسا[٦٩٣] ہو کہ تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے ان کو طلاق دے دی اور تم مہر مقرر کر چکے تھے تو اس صورت میں مقررہ مہر کا آدھا دینا چاہیے۔ ہاں اگر عورتیں اپنی خوشی سے معاف کر دیں یا وہ

Marfat.com

مرد درگزر کر جاتے جس کے ہاتھ میں رشتہ نکاح ہے اور مہر کی پوری رقم دے دے۔ اور یاد رکھو کہ درگزر کر جانا ہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور دیکھو باہم ایک دوسرے کے ساتھ احسان کرنا اور بھلائی کرنا نہ بھولو۔ اور خوب سمجھ لو کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو وہ اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

کیونکہ دلوں کے خیالات اور ذہنی کیفیات کی مرد و زن کے تعلقات میں بڑی اہمیت ہے اور اللہ کا ڈر اور اس بات کا اندیشہ کہ اللہ دلوں کی باتوں سے واقف ہے۔ یہ قانون کے نفاذ کی حتمی اور یقینی ضمانت ہے۔ آگے انسانی ضمیر کے اطمینان کے لیے فرمایا کہ خوب جان لو کہ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔

طلاق قبل الدخول

اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک ارتقاء روحانی کے لیے بہت بڑی رکاوٹ سمجھا گیا تھا۔ اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہو سکتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ تعلق ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حسن سلوک کا ہے۔ جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو اسے کیا معلوم کہ اس پر دنیا کے کیا فرائض ہو سکتے ہیں اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو کون سے فطری مواقع مل سکتے ہیں۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ میاں بیوی میں ازدواجی تعلقات اگر نکاح کے باوجود قائم نہ ہوں اور مہر بھی مقرر نہ ہو۔ یا مہر تو مقرر ہو لیکن ازدواجی تعلقات کی نوبت نہ آئی ہو تو اس قسم کے مواقع پر کس قسم کا اخلاقی نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ یہاں قرآن نے لفظ فضل استعمال کر کے تمام اخلاقی بزرگیوں کو کوزے میں بند کر دیا۔ فرمایا کہ اگر کوئی منکوحہ سے

Marfat.com

خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے تو شوہر پر آدھا مہر واجب ہو جاتا ہے یہ تو قانون ہوا مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسنِ اخلاق ہے اور یا شوہر ادا کر دے اور آدھا نہ کاٹے تو یہ مرد کا حسن اخلاق ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ اور آپس میں فضل کو نہ بھولو۔ اس طرح انسانی برادری میں قرآن نے ایک طرف عورت کو مرد کے ہمدوش بنا دیا اور دوسری طرف اخلاق کی بزرگیوں کا نام لے کر جتا دیا کہ روحانی ارتقاء میں اصل و اساس اخلاق کا حسن ہے۔ غور فرمائیے جس سے یہاں معاف کرنے کو کہا جا رہا ہے۔ کیا یہ وہ ہی جنس نہیں جس کی ہستی اسلام سے پہلے شرم و عار کا باعث تھی۔ جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا یا یہ حال ہے کہ اس سے کہا جا رہا ہے کہ عورت نرمی برتے، معاف کر دے۔ یہ کس قدر بلیغ اور موثر انداز ہے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ بیویوں کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے کی دعائیں کرتے تھے۔ ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریاتنا قرۃ اعین۔

۶۹۲۔ اگر تم عورتوں کو اس صورت میں طلاق دو کہ نہ ان کو ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا تو تم پر کوئی گناہ نہیں البتہ ایسی صورت میں ان کو فائدہ پہنچاؤ۔ مقدور والا اپنی حیثیت اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق دے۔ یعنی اگر نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ آیا۔ اور بلا مہر ہی نکاح کر لیا پھر بھی نکاح درست ہے مہر بعد میں مقرر ہو جائے گا۔ لیکن اس صورت میں اگر ہاتھ لگانے سے پہلے یعنی مجامعت اور خلوت صحیح سے پہلے ہی طلاق دے دی تو مہر کچھ لازم نہ ہوگا لیکن زوج کو لازم ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دے دے کم سے کم یہی کہ تین کپڑے کرتہ، سربند، چادر اپنی حالت کے موافق خوشی سے دے[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر یہ صورت پیش آجاتے کہ نکاح میں نہ مہر طے ہوا ہو اور نہ خلوت ہوئی ہو تو ایسی صورت میں شوہر کے ذمہ مہر واجب نہیں ہے بلکہ مہر کی جگہ اسے چاہیے کہ وہ دستور کے مطابق اسے کچھ دے دلا کر رخصت کرے دستور کے موافق سے مراد یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی مقرر نہیں بلکہ اس کا انحصار آدمی کے معیار زندگی پر ہے۔ ایک

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

غریب اپنی وسعت کے مطابق دے امیر اپنی وسعت کے مطابق۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس عورت کا کوئی مہر مقرر نہ تھا اور طلاق بھی خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہوگئی تو ایسی عورت کا مہر نہ دینے کا تم پر کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاں اس کو دستور کے مطابق کچھ سامان دینا چاہیے۔

مطلّقہ کے لیے متعہ کی مقدار

یہ سامان کیا اور کتنا ہونا چاہیے؟

اس کا جواب اگرچہ لوگوں نے مختلف دیا ہے لیکن قرآن نے جو کچھ بتایا ہے کہ یہ امارت اور غربت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہے بلکہ فراخ دست پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر مقدار کی تعیین مرد کی مالی حیثیت دیکھ کر مقرر کی جاتے تو ابوبکر الجصاص کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ جیسے یہ مالی حالت کے پیش نظر مختلف ہوگا ایسے ہی مختلف ذالک فی الازمان زمانے کے لحاظ سے بھی مختلف ہوگا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے مقدار کے بارے میں دو بنیادی شرطیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر کی حالت کو دیکھا جائے کہ مالی حالت کیسی ہے دوسرے یہ دیکھا جائے کہ وقت کا دستور اور قاعدہ کیا ہے۔ پہلی شرط اگر علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ سے معلوم ہوئی ہے تو دوسری شرط متاعا بالمعروف سے معلوم ہوتی ہے۔ معروف کا دار و مدار ہر زمانہ کی رسوم و عادات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور عادات و رسوم ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا متعہ کی مقدار کی تعیین میں ان دونوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور اس کی شرعاً کوئی تحدید نہیں جن بزرگوں سے ایک جوڑے، کچھ خرچے یا ایک خادم یا کرتہ، کساوا، مہر بند یا پانچ سو درہم یا خادم، خرچہ اور کپڑے یا دس ہزار۔ حافظ ابن کثیر نے سارے اقوال نقل کیے ہیں۔ یہ ان بزرگوں نے اپنے اپنے احوال و ظروف اپنے قومی اور ملکی رسوم و عادات کے مطابق پیش فرمایا ہے۔ بلکہ الجصاص نے امام ابوالحسن کرخی سے، ان دو شرطوں کے ساتھ عورت کی حالت کا بھی اعتبار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متعہ کی مقدار متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ

۱۔ مرد کا معیارِ زندگی کیا ہے
۲۔ عورت کا معیارِ زندگی کیا ہے
۳۔ ملکی اور قومی دستور کیا ہے

Marfat.com

ان تین باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر متعہ کی مقدار کی جائے گی۔

متعہ کس عورت کو دینا واجب ہے

متعہ کسے دیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر فقہاء صحابہ، فقہاء سبعہ اور آئمہ اجتہاد کے درمیان اختلاف ہے صحابہ میں حضرت علی ہر مطلقہ کے لیے متعہ کو ضروری بتاتے ہیں اور یہی امام زہری کی رائے ہے اور عبداللہ بن عمر جس عورت کو طلاق ایسی حالت میں ملی ہو کہ اس کا مہر مقرر نہ ہو اور مرد نے خلوت نہ کی ہو متعہ واجب کہتے ہیں۔ فقہاء سبعہ میں قاسم بن محمد کی بھی یہی رائے ہے اور یہی امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد اور امام زفر کی رائے ہے کہ متعہ صرف اس عورت کو دینا واجب ہے جس کا مہر مقرر نہ ہو اور خلوت سے پہلے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہو۔ یہی قرآن کی اس آیت کا منطوق ہے۔ قرآن میں ایک دوسرے موقعہ پر ہے۔

یاایھا الذین اذا نکحتم ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فما لکم من عدۃ تعتدونھا فمتعوھن و سرحوھن سراحا جمیلا

اے اہلِ ایمان جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کر لو اور پھر ان کو خلوت سے پہلے طلاق دے دو ان پر کوئی عدت نہیں ہے۔ ان کو کچھ سامان دے کر اچھے طریقے پر رخصت کر دو۔ (سورۂ احزاب)

یہ دونوں آیتیں بتا رہی ہیں کہ متعہ دینا واجب ہے کیونکہ

اوّلاً: متعوھن میں امر آیا ہے اور امر سے اصل میں وجوب ہی ثابت ہوتا ہے

ثانیاً: متاعا بالمعروف حقا علی المحسنین میں لفظ حقاً تاکیدی الفاظ میں سب سے زیادہ زوردار تعبیری پیمانہ ہے۔

ثالثاً: اس کے وجوب کو پرزور کرنے کے لیے اسے شرطِ احسان قرار دیا ہے۔ اور یہ ہر شخص کا پیش نہاد ہونا چاہیے کہ محسن بن کر رہے۔

امام مالک اور ان کے اصحاب اس مطلقہ کے لیے متعہ کو واجب نہیں بلکہ مستحب کہتے ہیں۔ اس کے باوجود اس پر علماء یک زبان ہیں کہ اس قسم کی مطلقہ عورت متعہ کے سوا کسی چیز کی حقدار نہیں ہے۔

Marfat.com

مہر مثلی کی تعریف

اس آیت سے یہ مسئلہ بھی ضمناً معلوم ہو گیا کہ اگر بوقت نکاح مہر کا ذکر نہ آیا ہو پھر بھی نکاح ہو جاتا ہے۔ جس عورت کا مہر نکاح کے وقت مقرر نہ کیا جائے اس کو مہر مثلی دینا پڑتا ہے۔ مہر مثلی کا مطلب یہ ہے کہ جو عورت کی قوم کا وقت کا دستور ہو یعنی جو اس عورت کی بہنوں، پھوپھیوں ددھیال کی لڑکیوں میں سے اس جیسی لڑکیوں کا جو مہر مقرر ہو وہ مہر مثل کہلاتا ہے۔ اگر کسی عورت کا نکاح اور مہر مقرر نہ ہوا اور شوہر کا انتقال ہو گیا تو عورت کو مہر مثلی دلایا جائے گا۔

آئمہ خمسہ نے حضرت علقمہ کے حوالہ سے عبداللہ بن مسعود کا یہ عدالتی فیصلہ نقل کیا ہے کہ

عبداللہ بن مسعود کی عدالت میں مقدمہ آیا کہ ایک عورت کی ایک شخص سے شادی ہوئی مہر کوئی مقرر نہ تھا۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تو حضرت عبداللہ نے فیصلہ کیا کہ اس کو شوہر کی جائداد سے میراث بھی ملے۔ یہ وفات کی عدت بھی گزارے گی اور اس کو مہر مثلی دیا جائے گا۔ معقل بن سنان صحابی نے جب عبداللہ کا فیصلہ سنا تو فرمایا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بروع دختر واشق کے معاملہ میں بھی ایسا ہی فیصلہ فرمایا تھا

(نیل الاوطار ص ۱۹۴)

متعہ کیوں دیا جاتا ہے

اگرچہ نکاح کے بعد شوہر کا ازدواجی رشتہ اس سے قائم نہیں ہوا اور مہر اس کا مقرر نہیں ہے مہر کی جگہ اب مرد کی فتوت اور بلند اخلاقی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے مہر نہ سہی کچھ ضرور دے دلا کر روانہ کرے۔ یہ عطیہ مہر کا ایک بدل ہونے کے علاوہ اس کا ایک نفسیاتی فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کا تعلق بالکل آغاز ہی میں ٹوٹ جانا عورت کے لیے ایک انتہائی تکلیف دہ امر ہے مگر اس عطیہ سے یہ فضا دور ہو کر نرمی اور معذرت کا ماحول پیدا ہو جائے گا اور عورت کے دل میں طلاق کا افسوس اور صدمہ کسی قدر کم ہو جائے گا۔ اسی لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ متعہ دستور کے مطابق ہو تاکہ معاشرہ میں انسانی مودت کا تقاضا پورا ہو جائے اور خوشگوار یادیں باقی رہیں مگر ساتھ ہی شوہر کو بھی اس کی استطاعت سے زیادہ کا حکم نہیں دیا۔

طلاق دراصل عورت کی زندگی پر ایک داغ ہے۔ معاشرے میں طلاق دہ مقام بلند

Marfat.com

نہیں رکھتی ہے جو دوسری عورتوں کا ہوتا ہے۔ معاشرے کی نگاہوں میں عورت کی پوزیشن بلند کرنے کے لیے قرآن نے شوہر پر متعہ کو واجب کر دیا۔ شوہر کی جانب یہ عطیہ اور یہ سامان گویا اپنی منکوحہ کی نزاہت کی شہادت اور اس بات کا اعتراف ہے کہ طلاق مرد اپنے کسی عذر کی وجہ سے دے رہا ہے عورت میں کسی کمزوری کی بنا پر نہیں دے رہا۔ یہ سامان دے کر وہ معاشرے میں عورت کی آبرو اور اس کی عزت کو قائم کرتا ہے اور گویا اس طرح اپنے اس کردار پر اس اقدام سے افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ تاریخ میں ہے کہ امام حسن نے اپنی ایک مطلقہ بیوی کو دس ہزار درہم متعہ دے کر فرمایا تھا کہ جدا ہونے والی دوست کی یہ کوئی قیمت نہیں ہے۔ اللہ اکبر اسلام نے عورت کو کیسی پستی سے اٹھا کر کس بلندی پر کھڑا کیا ہے۔

طلاق کی ایک اور صورت

۶۹۳۔ اگر ایسا ہو کہ تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے ان کو طلاق دے دی اور تم مہر مقرر کر چکے تھے تو اس صورت میں مقررہ مہر کا آدھا دینا چاہیے۔ یعنی اگر نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا تھا اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی تو آدھا مہر دینا لازم ہوگا[1] طلاق کی ایک صورت وہ تھی جو بیان ہو چکی یعنی نہ مہر طے ہوا تھا اور نہ خلوت ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی۔ دوسری صورت اب بیان ہو رہی ہے کہ مہر تو بوقتِ نکاح مقرر ہو چکا تھا لیکن خلوت نہیں ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی۔ عام قاعدہ ایسے موقع کے لیے یہ ہے کہ مہر کا نصف حصہ شوہر کے ذمہ واجب الادا ہوگا[2]

دو مستثنیٰ صورتیں

مگر عورت یا مرد جس کے اختیار میں ہے نکاح قائم رکھنا اور توڑنا اپنے حق سے درگزر کر دے تو بہتر ہے۔ عورت کی درگزر یہ کہ آدھا ہی معاف کر دے اور مرد کی درگزر یہ کہ جو مہر مقرر ہوا تھا پورا حوالے کر دے یا تمام مہر ادا کر چکا تھا تو آدھا واپس نہ لے بلکہ سارا مہر اس کے پاس رہے پھر فرمایا کہ مرد درگزر کرے تو تقویٰ کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ اللہ نے اسے بڑائی دی او

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] ماجدی

Marfat.com

مختار کیا ہے۔ نکاح باقی رکھنے اور طلاق دینے کا۔ اور نفس نکاح سے تمام مہر لازم ہو جاتا ہے اب بدون لگائے طلاق دے کر شوہر نصف مہر کو اپنے سے ہٹاتا ہے یہ تقویٰ کے مناسب نہیں ہے اور بیوی کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی۔ جو کچھ کیا شوہر نے کیا ان وجوہ سے شوہر ہی کو درگزر کرنا زیادہ مناسب ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ دو صورتیں اس حکم عام سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ بیوی اپنے حق سے تمامتر دستبردار ہو جائے اور نصف مہر بھی نہ لے اور دوسری صورت یہ کہ شوہر اپنے حق سے دستبردار ہو جائے یعنی جو نصف مہر اسے رکھ لینے کا اختیار ہے اسے بھی وہ نہ رکھے اور بجائے نصف کے پورا مہر ادا کر دے۔

طلاق والی عورتوں کی چار قسمیں

دراصل جیسے طلاق کی مختلف صورتیں ہیں ایسے ہی طلاق والی عورتوں کی بھی باعتبارِ خلوت اور ہم بستری مختلف صورتیں ہیں۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

طلاق کی مہر و خلوت کے اعتبار سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اولاً: یہ کہ نکاح ہو مگر مہر نہ ہو اور خلوت نہ ہو اور طلاق ہو گئی ہو۔

ثانیاً: یہ کہ نکاح ہو مہر بھی ہو مگر خلوت نہ ہو اور طلاق ہو گئی ہو۔

ان دونوں صورتوں کا حکم قرآن کی دونوں آیتوں میں معلوم ہو چکا۔

ثالثاً: یہ کہ مہر مقرر ہو اور خلوت بھی ہوئی ہو پھر طلاق ہو گئی۔ اس صورت میں مہر پورا دینا پڑے گا۔

رابعاً: یہ کہ مہر بوقت نکاح مقرر نہیں ہوا تھا اور خلوت کے بعد طلاق دے دی اس میں مہر مثلی دینا پڑے گا۔

یہی چاروں صورتیں شوہر کی وفات ہونے کی صورت میں بھی ہیں لیکن موت اور طلاق میں تھوڑا سا فرق ہے۔ مثلاً اگر مہر مقرر نہ تھا اور خلوت سے پہلے یا بعد میں شوہر کی وفات ہو گئی دونوں صورتیں مہر مثلی ادا کرنا پڑے گا اور بوقتِ نکاح مہر مقرر ہوا اور خلوت

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

سے پہلے یا بعد کو شوہر مر گیا تو ان دونوں صورتوں میں مقررہ مہر کی ادائیگی لازم ہو گی۔[1]

ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ مہر مقرر نہ تھا اور طلاق خلوت سے پہلے ہو گئی۔ اس صورت میں مہر نہیں صرف متعہ دینا واجب ہے۔ دوسرے مہر مقرر تھا لیکن طلاق خلوت سے پہلے ہو گئی اس صورت میں آدھا مہر ادا کرنا واجب ہے۔ یہ دونوں صورتیں قرآن نے ان دو آیتوں میں پیش کی ہیں، تیسرے یہ کہ مہر مقرر تھا اور طلاق خلوت کے بعد دی گئی تو اس میں پورا مہر ادا کرنا واجب ہے۔ چوتھے، مہر مقرر نہ تھا اور طلاق خلوت کے بعد ہوئی تو مہر مثلی ادا کرنا واجب ہے۔

شوہر کو میدانِ ایثار میں آگے بڑھنے کی تلقین

یہاں قرآن نے یہ فرمانے کے بعد کہ عورت معاف کر دے یا شوہر معاف کر دے بیدہ عقدۃ النکاح کہہ کر مرد کو اکسایا ہے کہ اس کی فتوتِ مردانگی، بلند حوصلگی اور اس کے درجے اور مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت سے اپنے حق کی دستبرداری کا خواہش مند نہ ہو بلکہ ایثار کے میدان میں خود آگے بڑھے۔ اس ایثار کے لیے قرآن نے یہاں مرد کو تین پہلوؤں

اولاً یہ کہ مرد کو اللہ نے یہ فضیلت عطا فرمائی ہے کہ وہ نکاح کی گرہ کو جس طرح باندھ سکتا ہے اسی طرح کھول بھی سکتا ہے۔

ثانیاً یہ کہ ایثار و قربانی جو تقویٰ کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے وہ جنس ضعیف کے مقابلے میں جنسِ قوی کے زیادہ شایانِ شان ہے۔

ثالثاً، یہ کہ مرد کو اللہ سبحانہٗ نے اس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت پر جو ایک درجہ ترجیح بخشا ہے اور جس کے سبب سے اس کو عورت کا قوام اور سربراہ بنایا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کو عورت کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے وقت مرد کو نہ بھولنا چاہیے اس فضیلت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہیں بلکہ اس کو دینے والا ہے۔[2]

---

[1] افاداتِ شیخ الہند　[2] تدبرِ قرآن

Marfat.com

ایک آئینی نکتہ

اس آیت میں مبصرین اور قانون سازی کرنے والوں کے لیے ایک اہم آئینی نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ یہ کہ نکاح کی گرہ جس طرح مرد کے قبول سے بندھتی ہے۔ اسی طرح نکاح کی گرہ مرد کی طلاق سے کھلتی ہے یا پھر عدالت کے ذریعے گویا یہ سررشتہ اصلاً قرآن نے مرد ہی کے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس لیے طلاق کے معاملے میں عورت کو مرد کے مساوی اختیار دینے کا رجحان جو مغرب کی نقالی میں ہمارے مسلمان ملکوں کے قانونی اداروں میں بڑھتا جا رہا ہے۔ قرآن کی روح کے خلاف ہے اور اس سے خاندانی نظام کا شیرازہ پراگندہ ہو جانا یقینی بات ہے۔

یاد رہے کہ طلاق کے بارے میں عدالت کو جو اختیار ہے وہ بھی خاص حالات میں شوہر کی نیابت ہے۔ اگر قرآن عورت کو اس معاملہ میں کسی درجہ میں اختیار دینا چاہتا تو مرد کے متعنت ہونے، مفقود ہونے یا اس قسم کی دوسری صورتوں میں عدالت کو اختیار نہ دیتا بلکہ عورت سے کہہ دیتا کہ وہ بھی مرد کو طلاق دے دے۔

کچھ لوگوں نے یہاں بیدہ عقدۃ النکاح سے عورت کا ولی مراد لیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ سنن دارقطنی میں اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عقدۂ نکاح کا ولی شوہر ہے۔

صحابہ میں حضرت علی، عبداللہ ابن عباس، تابعین میں سعید بن المسیب، شریح قاضی، نافع بن جبیر، محمد بن کعب، طاوس، مجاہد، شعبی، سعید بن جبیر، آئمہ میں امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری کی یہی رائے ہے۔

۶۹۴ - اور یاد رکھو کہ درگزر کر جانا ہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور دیکھو باہم ایک دوسرے کے ساتھ احسان کرنا اور بھلائی کرنا نہ بھولو۔ اور خوب سمجھ لو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس آیت کے ذریعہ دونوں کو فضائل اخلاق فراہم کرنے کی تلقین کی ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ ایک ہی موقعہ پر حکم و حکمت دونوں میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ ابھی ابھی وہ عزیز ہونے کی حیثیت میں آرڈر اور حکم دے رہا تھا اور

Marfat.com

یکبارگی وہ حکیم ہونے کی حیثیت میں　قانون پر عمل پیرا ہونے والوں کو فضائلِ اخلاق کا درس دینے لگتا ہے۔ کبھی وہ حاکم ہونے کی حیثیت میں قرآن میں قانونِ حکومت بناتا ہے اور ساتھ ہی حکیم ہونے کی حیثیت میں وہ قانون کے منافع اور مصالح سے بحث شروع کر دیتا ہے۔ یہاں قرآن نے اب فضائلِ اخلاق کا موضوع چھیڑ دیا ہے اور فضائلِ اخلاق کی سب سے زیادہ ضرورت ازدواجی زندگی میں ہے۔ غور فرمائیے کہ اخلاقی فضائل میں سے ازدواجی سے مناسب دو اخلاقی بزرگیوں کا کیسے حسین انداز میں پیوند لگایا ہے۔ ایک عفو و درگزر دوسرے فضل و احسان۔ عفو و درگزر خود اللہ سبحانہٗ کی بہت بڑی صفت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو دُنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات سونی پڑ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری صفتوں میں اپنی اسی صفت کی تجلّی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے۔

او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفواً قدیراً ؛

یا کسی بُرائی کو معاف کرو بے شک اللہ معاف کرنے والا قدیر ہے۔

یہاں مرد و زن دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ معاف کرو معاف کرنا ہی تمہیں متقیانہ سیرت کا علمبردار بنا دے گا۔ کیونکہ گھر کی زندگی میں جو متقی نہیں ہے وہ پوری دُنیا میں اتقیا کی امامت کیسے کرے گا؟ اور عفو و درگزر سے بڑھ کر یہ بھی فرمایا کہ تمہیں باہم فضل و احسان کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے۔ فضل کے لفظ میں اس قدر جامعیت، عموم اور ہمہ گیری ہے کہ یہ ہر نیکی کے کام کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان تمام صورتوں میں ایک عام شکل یہ ہے کہ فضل نام ہے دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا کہ جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔ غور فرمائیے یہ بات کس موقعہ پر فرمائی ہے۔ نکاح کے موقعہ پر نہیں بلکہ طلاق کے موقعہ پر جو تعلقات کی بقا کا نہیں بلکہ تعلقات کے انقطاع کا نام ہے۔ باہمی حسنِ سلوک، مروت، رعایت اور احسان سے نہ چوکو۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آجانے سے صحبتِ قدیم و محبتِ سابق کے حقوق زائل نہیں ہوتے بلکہ حالتِ طیش و ناگواری میں بھی تقویٰ، حسنِ اخلاق، عفو و درگزر اور فضل و احسان کرنا چاہیے۔ اور آخر میں فرمایا کہ یہ تمہیں اس لیے کرنا چاہیے کہ اللہ کی نگاہ سے تمہاری عملی زندگی کا ہر گوشہ پوشیدہ نہیں ہے۔

اللھم اجعلنا من الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس والمحسنین ۔

Marfat.com

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ
قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ
فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝

نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور پر بیچ والی نماز کی،[۶۹۵] اور نمازوں میں خدا کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہو۔[۶۹۶] اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل یا سوار جس حالت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو۔[۶۹۷] پھر جب خطرہ دُور ہو جائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اُس نے تم کو سکھایا ہے جسے تم نہیں جانتے تھے۔[۶۹۸]

نمازوں کی محافظت

یہ آیت بغیر کسی پیوند کے یہاں آئی ہے۔ یعنی ایسا حرف کوئی نہیں آیا جو اسے پہلے سے مربوط کرے۔ علمارِ السنہ کی زبان میں اسے استئناف کہتے ہیں۔ ایسا کیوں کیا جاتا ہے۔ عُلمارِ بلاغت کہتے ہیں کہ ایسا ان مواقع پر کیا جاتا ہے جب کسی اُٹھے ہوئے سوال کا جواب دینا ہوتا ہے۔ اس موقعہ پر نکاح و طلاق کے قوانین کے بیان میں قانون کی پابجائی کے لیے یک دم اخلاقی فضائل، مواعظ و نصائح کا بیان اس طرح آیا ہے کہ ذہنوں میں یہ سوال خود بخود ابھرتا ہے کہ انسان جو خواہشوں کا بندہ اور غرض پرستیوں کی مخلوق ہے کیونکر ایسی اخلاقی طاقت پیدا کر سکتا ہے کہ ازدواجی زندگی کی اخلاقی آزمائشوں میں پورا اُترے؟ اس سوال کا جواب اس آیت میں یہ دیا ہے کہ اس کی راہ صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی بندگی اور نیازمندی اور

Marfat.com

فرماں برداری کی سچی رُوح اپنے اندر پیدا کی جائے اور خدا کی طاعت و نیازمندی پیدا کرنے کا ذریعہ اللہ کی عبادت ہے اور اللہ کی عبادات میں سب سے طاقتور عبادت نماز ہے۔ لہٰذا چاہیے کہ نماز کی محافظت کرو اور نماز پڑھو تو اس طرح پڑھو کہ خشوع و خضوع میں ڈوبے ہوئے ہو۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں کہ طلاق کے احکام میں نماز کو بیان کرنے کی چند وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ دُنیا کے معاملات میں پڑ کر کہیں خدا کی عبادت نہ بھلا دینا۔ دوم یہ کہ ہوا و ہوس کے بندوں کو بوجہ غلبہ حرص و بخل عدل کو پورا کرنا اور انصاف سے کام لینا اور وہ بھی رنج و غم اور غصہ کی حالت میں بہت دُشوار ہے۔ اس حالت میں عفو و درگزر اور فضل و احسان پر ان کا عمل پیرا ہونا کچھ مستبعد معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے فرمایا کہ کوئی بات نہیں اس کا علاج یہ ہے کہ نماز کی محافظت اور اس پر پابندی کرو اور نماز کے حقوق کی پوری پوری رعایت کرو۔ نماز کو ازلہ رذائل اور تحصیلِ فواضل میں بڑا اثر ہے۔

نیز اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام میں معاشرت، معاملات، قانون و اخلاق کے مسائل عبادات سے الگ نہیں اور نظامِ شریعت میں خالق کے حقوق اور مخلوق کے حقوق دوش بدوش ہیں۔ ان میں کوئی دوئی نہیں ہے۔

۶۹۵۔ نمازوں کی نگہداشت کرو خاص طور پر بیچ والی نماز کی۔ بیچ والی نماز سے عصر کی نماز مراد ہے کہ دن اور رات کے بیچ میں ہے۔ اس کی تاکید زیادہ فرمائی کہ اس وقت دُنیا کا مشغلہ زیادہ ہوتا ہے[1]

اس آیت میں دو باتیں تشریح طلب ہیں ایک نمازوں کی محافظت دوسرے الصلوٰۃ الوسطیٰ کی تحقیق۔

محافظت کے معنے کسی چیز کی حفاظت میں خوب کوشش کرنے اور اس پر مداومت کرنے کے ہیں۔ جب یہ لفظ علیٰ کے ساتھ استعمال ہو تو اس کے معنے مداومت اور ہمیشگی کرنے کے آتے ہیں۔ الصلوات جمع ہے اس کا واحد صلوٰۃ ہے۔ اس سے مراد یہ پانچ نمازیں ہیں۔ نمازِ فجر، نمازِ ظہر، نمازِ عصر، نمازِ مغرب، اور نمازِ عشا۔ پوری اُمت اس پر متفق ہے کہ ان پانچوں نمازوں میں سے ایک کا منکر بھی مسلمان نہیں رہ سکتا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

پانچ نمازیں قرآن سے

پانچ نمازیں ویسے تو تواتر عملی سے ثابت ہیں جن کی قطعیت ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہے۔ لیکن علماء نے اس آیت سے بھی استنباط کیا ہے کہ نمازیں پانچ ہیں۔ الصلوٰات جمع ہے۔ جمع اگرچہ تین پر بھی بولا جاتا ہے لیکن صلوٰۃِ وسطیٰ نکل کر تین ہونے کی صورت میں الصلوٰات میں جمع کے معنے نہیں رہتے اس لیے یہاں حتماً پانچ مراد ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ نکل کر بھی جمع کے معنے باقی رہیں۔ چونکہ بعض مستشرقین نے دانستہ یا نادانستہ طور پر نماز کی تعداد اور اس کے اوقات کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی ہے۔ دیکھو دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں لفظ صلوٰۃ اس لیے ضرورت ہے کہ اس موضوع پر سینہ قرآن سے اُبلی ہوئی ہدایات عام ناظرین کو معلوم ہوں۔

مکی زندگی میں سورۃ طور دعوت کے پُر آشوب زمانے میں نازل ہوئی۔ اس میں حکم ہوا۔

اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کیجئے، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور اپنے رب کی تسبیح کر جب تو نماز کو کھڑا ہو اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کی پیٹھ پھیرتے وقت۔ (طور ۲۰)

سورۃ دہر میں جو رائے عامہ کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورۃ طور کے بعد نازل ہوئی ہے ان ہی معنوں میں ایک اور آیت آئی ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جسے نمازِ عصر کہتے ہیں کا ذکر ہے۔ یہ گویا ایک اور نماز بڑھی۔ پہلے نماز تہجد کے ساتھ نمازِ عشا، نمازِ فجر تھی اب نمازِ عصر فرض ہوئی۔ سورۃ دہر میں ہے:

صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کرو اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کر۔

اس میں رات کی دیر تک نماز کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائے شب۔ اصل ارشاد میں لفظ اصیل اور من اللیل آیا ہے۔ اصیل دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہے اصیل کہلاتا ہے۔ ابھی نمازیں تین تھیں ایک فجر کے وقت ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو اسی لیے ابھی باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا حکم تھا۔ ان تین وقتوں میں عبادت نے اب باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کر لیا تھا اس لیے حکم ہوا۔

اقم الصلوٰۃ طرفی النہار وزلفا من اللیل ۔

دن کے دونوں کناروں فجر و عصر اور رات کے ایک حصہ میں نماز ادا کر۔

یہ آیت سورۃ ہود جو مکہ میں نازل ہوئی اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلے میں یہ پہلی آیت ہے جس میں تسبیح کی بجائے باقاعدہ نماز کی اقامت کا حکم آیا ہے۔ گویا اب تک تین نمازیں نمازِ فجر، نمازِ عصر، اور نمازِ عشا باقاعدہ فرض ہو چکی ہیں۔

اب آہستہ آہستہ نماز کی تکمیل کی طرف قدم بڑھا۔ سورۃ روم جو مکہ میں نازل ہوئی اور رومیوں کی شکست کے بعد نازل ہوئی ہے فرمایا:

اللہ کی تسبیح کرو جب شام کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں ہے اور دن کے آخری حصہ میں اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔

اس آیت پاک میں زوال کے بعد ظہر اور غروب سے پہلے عصر کی مبہم نمازوں کی توضیح کر دی گئی۔ تمام آیات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، نور، دہر، ہود، ق، روم اور نور میں ظہر کا بالاجمال دہر، ق، طٰہٰ اور روم میں اور بالتصریح اسرا اور روم میں عشاء کا بصورت صلوٰۃ اللیل مزمل، طور اور دہر میں اور بصورتِ عشاء بالاجمال طٰہٰ، ہود میں، اور بالتصریح ق اور نور میں ہے۔

زیرِ نظر آیت مدنی ہے پانچوں نمازیں فرض ہو چکی ہیں۔ اب اس آیت میں ان نمازوں کی پابندی، نگہداشت اور ان پر مداومت کا حکم دیا جا رہا ہے اس کے لیے اس آیت میں محافظت کا لفظ آیا ہے اس کے لفظی معنے نگرانی کے ہیں اور اس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہیں۔ یہاں محافظت کا لفظ اس پہلو کی طرف بھی اشارا کر رہا ہے کہ مشکل اور پُرخطر حالات میں بھی ہر طرح کے خطرات کا مقابلہ کر کے اس کی حفاظت کی جائے۔

نماز مومن کی دینی زندگی کا حصار ہے

یہ بات کہ نماز پورے دین کے لیے بمنزلہ حصار اور شہر پناہ ہے۔ اگرچہ قرآن کے قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے اس کے شواہد قرآن میں ایک سے زیادہ ہیں لیکن اس آیت میں یہ بات محافظت کے عنوان سے پیش کی ہے جو اس نماز کی تمام ظاہری اہتمام کی ایک

Marfat.com

جامع تعبیر ہے اور جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ درحقیقت نمازوں کی حفاظت ہی دین کی دوسری تمام باتوں کی حفاظت کی ضامن ہے۔

اس پارے میں تمام احکام سے پہلے استعانت بالصلوٰۃ کا حکم دیا ہے اور اب معاشرتی احکام کے ختم ہونے پر یکایک محافظت صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ نماز ہی سے آغاز اور نماز ہی پر معاشرتی احکام کا اختتام کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح ایک شہر پناہ پورے شہر کو اپنی حفاظت میں لیے ہوتی ہے اسی طرح نماز دوسری تمام نیکیوں کو اپنی حفاظت میں لیے ہوتے ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نماز سارے دین کی محافظ ہے۔ تم اس کی محافظت کرو یہ پوری زندگی میں تمہاری پاسبان رہے گی۔

الصلوٰۃ الوسطیٰ کا مطلب

صلوٰۃ کے معنی نماز اور وسطیٰ وسط سے بنا ہے۔ اوسط کا مونث ہے۔ اس کے دو معنے آتے ہیں ایک درمیان اور دوسرے بہترین۔ اور علماء نے دونوں معنے کی رعایت سے اپنے اپنے مذاق کے مطابق تشریح کی ہے۔ اصل میں لغوی معنے تو درمیانی اور بیچ والی کے آتے ہیں۔ چونکہ درمیان افراط و تفریط سے ہٹ کر ہوتا ہے اس لیے مرادی معنے بہترین کے ہیں۔ قرآن میں مسلمانوں کو اُمۃً وسطاً اسی رعایت سے کہا گیا ہے۔ بہرحال بہترین ہو یا درمیانی زمانہ صحابہ سے قرآن کے شارحین نے اپنے ذوق کے لحاظ سے اس کی تعیین کی ہے لیکن سب نے یہ تعیین نمازوں کے مقابلے میں کی ہے۔ آج تک کسی نے نمازوں کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں کی ہے۔ صحابہ کی نظر میں یہ بات ضرور تھی کہ دن بھر کی پانچ نمازوں میں بیچ کی یا بہترین نماز کون سی ہے لیکن افضل ہونے کا یہ مطلب کہ ایسی نماز جو ظاہر و باطن میں بہترین نماز ہو یا ایسی نماز جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع ہو کسی نے نہیں بتایا کیونکہ اس سے آیت میں قطعاً کوئی معنویت نہیں رہتی۔ اس مطلب کے ساتھ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ نماز پڑھنے کی یہ کیفیت ہونی چاہیے قرآن محافظت کے ذریعہ کیفیت کا نہیں بلکہ ایک محسوس اور مرئی پیمانۂ عمل کی نگرانی کا مطالبہ کر رہا ہے مولانا آزاد ترجمان القرآن میں آیت کا یہ ترجمہ ایسی نماز جو اپنے ظاہر و باطن میں بہترین نماز ہو اور مولانا مودودی تفہیم القرآن میں یہ ترجمہ ایسی نماز جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو کر کے

Marfat.com

خبر نہیں اپنے مخاطبوں کے ذہن میں کیا اتارنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نماز کے بہترین ہونے کا مدار نماز میں نمازی کی کیفیات خشوع و خضوع پر ہے۔ اور قرآن ان کیفیات والی نماز کی نگرانی کی تاکید کر رہا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو یہ آیت قرآنی کا نہ منطوق ہے نہ مدلول اور نہ مفہوم۔ یہاں نماز کو نمازوں کے مقابلے پر بہترین کہا گیا ہے نمازیوں کے مقابلے میں نہیں کہا گیا یعنی یہ بتانا نہیں ہے کہ کس کی نماز بہترین ہے۔ علماء نے اسی حیثیت سے اس پر بحث کی ہے اور اسی بنیاد پر بہترین نماز کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ علامہ قرطبی نے تفسیر میں بارہ قول نقل کیے ہیں۔ ہمیں ان میں سب سے زیادہ پسند وہ ہے جس میں نمازِ عصر کو صلاۃِ وسطیٰ کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ یہی جمہور کا مذہب ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

امام ترمذی اور امام بغوی نے اسی کو اکثر علماءِ صحابہ کا مسلک قرار دیا ہے۔ قاضی ماوردی کہتے ہیں یہی جمہور تابعین کی رائے ہے۔ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر فرماتے ہیں کہ محدثین کا یہی خیال ہے۔ ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ رائے عامہ اسی کی ہمنوا ہے۔ حافظ دمیاطی نے اپنی کتاب (کشف الغطا) میں اسی کو راجح بتا کر حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت سمرہ ابن جندب، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابو سعید خدری، حضرت حفصہ، حضرت اُم سلمہ، حضرت اُم حبیبہ، حضرت ابنِ عمر، حضرت ابنِ عباس اور حضرت عائشہ کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ یہی عبیدہ، ابراہیم نخعی، زر بن حبیش، سعید بن جبیر، ابن سیرین، الحسن، قتادہ، الضحاک، الکلبی، مقاتل اور عبید کی رائے ہے۔ اسی کو آئمہ میں احمد بن حنبل، شافعی، اور بقول ابن المنذر ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد نے اختیار کیا ہے۔ (ابن کثیر ج ۱ ص ۲۹۱)

ان اکابر نے ایسا کیوں کہا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ علی ابن ابی طالب فرماتے ہیں کہ غزوہ احزاب میں مشرکین کے حملے کی وجہ سے حضور انور اور صحابہ کرام کی نمازِ عصر رہ گئی۔ آپ نے اس وقت فرمایا۔ اللہ ان کے گھروں اور دلوں کو آگ سے بھر دے جنہوں نے ہماری صلوٰۃ وسطیٰ نمازِ عصر فوت کرا

Marfat.com

پھر آپ نے یہ نمازِ عصر مغرب اور عشا کے درمیان پڑھی۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں آئی ہے اور حافظ ابن کثیر نے اس کے مخارج اور اس کی روایتی حیثیت پر خوب سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک مرفوع حدیث بھی پیش فرمائی ہے جس میں سمرہ ابن جندب کے حوالہ سے حضور انور کا یہ ارشاد ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ نمازِ عصر ہے۔ یہ حدیث مسندِ احمد، ترمذی میں ہے اور ترمذی نے اس کے حسن اور صحت پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے اور اس کے علاوہ بھی دوسری احادیث اس موضوع پر آئی ہیں۔ تاریخ و روایت کی اتنی بڑی طاقتور شہادت کے باوجود کہنے والوں نے یہ کہنے کی کیسے جرأت فرمائی ہے کہ

اس سے سمجھا گیا ہے کہ آپ نے نمازِ عصر کو صلوٰۃِ وسطیٰ فرمایا ہے

یعنی حضور نے خود تو یہ بات نہیں فرمائی ہے مگر لوگوں نے حضور انور کی بات کی مراد یہ سمجھ لی حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ احزاب میں حضور نے دُعا میں الفاظ ہی یہ فرمائے تھے شغلونا عن الصلوٰۃ الوسطیٰ صلاۃِ العصر۔

یہ صحابہ کی سمجھی ہوئی بات اس وقت ہوتی جب ارشادِ نبوت میں صلاۃ العصر کی تصریح نہ ہوتی لیکن جب ارشاد میں خود یہ تصریح ہے تو اسے لوگوں کی سمجھی ہوئی بنا کر بے وزن کرنا کچھ اچھا نہیں ہے۔ علامہ شوکانی نے اس موقف کی درستگی اور صحت پر یہ فرما کر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے کہ یہی مذہب حق ہے اسی کو اپنانا چاہیے اور کوئی انصاف پسند آدمی اس کی صحت میں شک نہیں کر سکتا۔ (نیل الاوطار)

بہر حال اس میں تو علماء نے اختلاف کیا ہے کہ معروف پانچ نمازوں میں کون سی نماز صلاۃِ وسطیٰ ہے اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں یہ سارے اقوال جمع کر دیے اور ان کی تعداد ۱۷ تک بتائی ہے۔ عصر، ظہر، مغرب، عشاء، فجر، جمعہ، ساری نمازیں، عشا اور صبح دونوں، پانچوں میں سے ایک صبح اور عصر، نماز باجماعت، صلوٰۃ الخوف، وتر نماز، عید قربان، نمازِ عید الفطر، نمازِ چاشت، جمعہ بروز جمعہ اور اس کے علاوہ ظہر ان تمام اقوال کا محور الصلوات ہیں۔ یعنی نمازیں ہیں۔ بہر حال صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد نمازِ عصر ہے۔

عصر کی نماز صلوٰۃِ وسطیٰ کیوں ہے

یہ نماز ہماری تمام نمازوں میں ایسی نماز ہے جو رات اور دن دونوں کی سرحد پر واقع ہے

Marfat.com

اگرچہ بہ حیثیت صبح کی نماز کو بھی حاصل ہے لیکن جس سرحد پر عصر کی نماز واقع ہے وہ عام حالات میں بھی پُرخطر ہے۔ صبح کا وقت بے شک راحت اور آرام کا وقت ہے اور اس لیے اس وقت کی نماز قیمتی ہے مگر عصر کے وقت دن کی تمام سرگرمیاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوتی ہیں۔ اس لیے طالبانِ دُنیا کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش کی گھڑی ہوتی۔ مسافرات سے پہلے گھر پہنچنا چاہتا ہے، دکاندار دکان بڑھانے سے پہلے کچھ کمائی کی فکر میں ہے۔ نوکر اپنی مقررہ ڈیوٹی کے سرانجام دینے کے چکر میں ہے۔ یہاں تک کہ میدانوں میں کھلاڑی بھی اپنے آخری داؤں اور اپنی آخری بازی کے منصوبوں میں ایسے غرق ہوتے ہیں کہ کسی کو کسی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے قرآن نے عام نمازوں کی نگہداشت کے حکم میں عصر کی نماز کے لیے نگہداشت کا خاص حکم دیا۔ رہا یہ سوال کہ اگر مقصود عصر کی نماز تھی تو اسے صاف صاف عصر کے لفظ ہی سے کیوں تعبیر نہیں کر دیا اس کا جواب یہ ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے اس نماز کا وہ نازک محل وقوع ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کی وجہ سے یہ خاص نگہداشت کی محتاج ہے [1]

۶۹۶۔ اور نمازوں میں اللہ کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہو جاؤ یعنی نماز میں ایسی حرکت نہ کرو کہ جس سے معلوم ہو جائے نماز نہیں پڑھ رہے ہو۔ ایسی باتوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے جیسے کھانا پینا یا کسی سے بات کرنا، ہنسنا [2] گویا آیت کے آغاز میں نماز کی کمیت کی طرف متوجہ کیا تھا کن اوقات میں اور کتنی کتنی رکعات اور کن آداب و شرائط کے ساتھ نمازیں پڑھنی چاہئیں اور اس انجام میں نماز کی کیفیت کی طرف متوجہ کیا ہے یعنی کیسے پڑھنی چاہیے۔ قرآن نے اس فقرے میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے لغت میں اس کے حسبِ ذیل معنے ہیں۔ چُپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا۔ بعض علماء نے ان معنے کو دس تک پہنچا دیا ہے اور علامہ ابن العربی نے اپنی ایک نظم میں ان کو بیان کیا ہے۔ قنوت کے ان متعدد معانی میں سے ہر معنے نماز میں مقصود ہیں۔ کیونکہ نماز میں ذکر و قرأۃ، تسبیح و استغفار، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے وہ

---

[1] تدبرِ قرآن [2] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

خدا کی بندگی بھی ہے دُعا بھی ہے، عبادت بھی ہے۔ اس میں دیر تک قیام بھی ہے اور عاجزی کا اظہار بھی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی کسی نماز میں کم ہو تو اسی قدر نماز کی کیفیت میں کمی ہو جائے گی۔ شیخین اور اصحابِ سنن نے علاوہ ابنِ ماجہ کے زید بن ارقم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ صحابہ کرام نماز میں باتیں کرتے تھے۔ قرآن کی یہ آیت جب نازل ہو گئی تو ہمیں نماز میں خاموش رہنے کا حکم مل گیا۔

نماز خوف میں بھی معاف نہیں ہے

۶۹۷۔ اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل ہو یا سوار جس حالت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو۔ یعنی اگر لڑائی اور دُشمن سے خوف کا وقت ہو تو ناچاری کو سواری پر اور پیادہ بھی اشارہ سے نماز درست ہے گو قبلہ کی طرف مُنہ بھی نہ ہو[1]

پیدل سوار کے لیے اصل ارشاد میں رجالا اور رکبان کے الفاظ آتے ہیں۔ رجال راجل کی جمع ہے اور رکبان راکب کی جمع ہے۔ راجل پیدل کو کہتے ہیں اور راکب سوار کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر دُشمن نے خطرے کی حالت پیدا کر دی ہو اور ایسی حالت میں نماز شرائط و آداب کے ساتھ ادا کرنی ممکن نہ ہو اور وہ کیفیت و جمعیت نہ حاصل ہو سکتی ہو جس کا فقہ و اللہ قانتین میں مطالبہ ہے تو پھر بھی نماز کی کمیت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے کہ یہی نماز کی محافظت ہے۔ پیدل یا سوار جس حالت میں نماز ادا کر سکتے ہو نماز ادا کرو۔ اس سے اسلام میں نماز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ نماز حالتِ خوف میں معاف نہیں ہوتی۔ نماز کی پابندی اور نگرانی بہر حال کرنی ہے۔ ترکِ نماز کی اجازت خطرے کی موجودگی میں بھی نہیں ہے ہاں قرآن میں دوسری جگہ ماحول کی رعایت سے وہ شکل و صورت بھی بتا دی جو خطرے کی حالت میں نماز باجماعت کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی نگرانی اور اس کی پابندی قرآن کے نزدیک ایمان کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ قرآن نے دوسرے موقع پر ایک جماعت کے اسلام کی صحت کی شرط نماز اور زکوٰۃ کو بتایا ہے۔ اسلام کی نظر میں فرد اگر نماز نہیں پڑھتا تو گنہ گار اور جماعت

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

اگر نماز نہیں پڑھتی تو وہ اسلام کی باغی ہے اور قانونِ بغاوت کے تحت اس سے معاملہ ہونا چاہیے۔ اسلام کا قانونِ بغاوت ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۂ مائدہ میں آئے گی۔ کسی جماعت کی دینی اخوت کی بنیادی شرط یہی نماز ہے۔ اسلامی مملکت کے شہریوں کے لیے وفاداری کا نشان اور اسلامی مملکت کے سربراہوں کے لیے اسلامیت کی علامت بھی قرآن نماز کو قرار دیتا ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۂ حج میں آئے گی۔ اسلام کے عہدِ اقتدار میں مسلمانی کی پہچان نماز تھی۔ افسوس زمانۂ حاضر میں مسلمانوں کی نماز سے بے رُخی اس حد تک ہو چکی ہے کہ ہمارے شاعر کو یہ شکوہ کرنا پڑا۔

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

اس کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان دینی عقیدے کا نہیں ایک سیاسی قومیت کا نام ہو گیا ہے۔ مسلمان ہونے کی نشانی دینداری نہیں ہے بلکہ مسلمان قوم کا فرد ہونا ہے۔

انا للہ وانا الی اللہ المشتکی

حضور انورؐ کا تمام نبیوں میں امتیازی مقام

۶۹۸۔ پھر جب خطرہ دُور ہو جائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے جسے تم نہیں جانتے تھے۔ یعنی جب امن کے حالات میسّر ہوں تو اس طرح اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ یہاں یاد کرنے سے مراد نماز ہے اور نماز کے موضوع پر یہاں اس فقرے کما علمکم ما لم تکونوا تعلمون سے بڑی معنے خیز بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلمؐ کی تعلیم اللہ پاک کی تعلیم ہے کیونکہ قرآن میں نماز کا حکم آیا ہے لیکن اس کے ادا کرنے کا طریقہ کہیں نہیں بتایا گیا۔ یہ چیز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلمؐ کی تعلیم سے اُمّت کو معلوم ہوئی۔ اور حضور کی تعلیم ہی کو اس آیت میں اللہ نے اپنی تعلیم بتایا ہے کیونکہ تمام نبیوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلمؐ کو جو خاص فوقیت اور امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لے کر آئے اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی اور نہ وہ کسی حیثیت سے مجمل اور مبہم ہے بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرما دی اور خود عمل پیرا ہو کر اپنے تمام پیروؤں سے اس پر عمل کروا کر اس کے بارے میں پیدا ہونے والے ہر شک و شبہ کی جڑ کاٹ دی۔ قرآن نے جس روزانہ

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ
مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا
فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ
مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ
اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ رکوع ۳۱

۱۵

اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیوہ عورتیں چھوڑ جائیں اور مرنے سے پہلے اس طرح کی وصیت کر جائیں کہ برس دن تک انہیں نان و نفقہ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔ اور پھر ایسا ہو کہ وہ مقررہ مدت سے پہلے گھر چھوڑ دیں اور دوسرا نکاح کر لیں یا نکاح کی بات چیت کر لیں تو جو کچھ وہ جائز طریقہ پر اپنے لیے کریں گی اس کے لیے تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم ضرور ان کو وصیت کی خاطر روکو۔ یاد رکھو اللہ سب پر غالب اور اپنے ہر کام میں حکمت رکھنے والا ہے[۲۹۹] اور دیکھو جن عورتوں کو طلاق دے دی ہو تو چاہیے کہ اُن کو مناسب طریقہ پر فائدہ پہنچایا جائے۔ متقی

Marfat.com

انسانوں کے لیے ایسا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تم پر اپنی آیات واضح کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو اور سوچو سمجھو۔

طریقِ عبادت نماز کو پیش کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان آداب و شرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریح فرمادی اور ان میں سے ہر چیز ناقابلِ شک قومی و عملی تواتر کے ذریعے سے اُمت کو پہنچی۔ نماز کس طرح پڑھنی چاہیے، اس میں کیا پڑھنا چاہیے کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہیے، کس وقت کی نماز کی کتنی رکعتیں ہیں ان میں سے ہر چیز کی زبانی تشریح فرمائی، صحابہ کو تلقین کی اور عملاً نبوت کی پوری زندگی میں جو حکم نماز کے بعد گزری، ایک دن دو دن نہیں کم از کم مدینہ میں متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ، تمام جماعتِ مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ وصالِ مبارک والی بیماری میں بھی اس سے تخلف نہ ہوا۔ اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا۔ اس پورے نظام کو اور اس پورے ماحول کو قرآن نے یہاں اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا اس نے تم کو سکھائیں وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ حضور انور چونکہ اللہ کی جانب سے سکھانے پر مامور تھے ویعلمکم الکتاب والحکمۃ اس لیے ایک معلم ہونے کی حیثیت میں آپ نے اُمت کو جو کچھ بھی سکھایا وہ اللہ ہی نے سکھایا۔

بیوہ کے لیے مرحوم شوہر کی وصیت

اس سے پہلے آیات میں مطلقات کے متعہ کا ذکر کیا تھا۔ اس آیت میں بیوہ کے متعہ کا ذکر کیا جارہا ہے۔ بیوہ غریب ظہورِ اسلام کے وقت یوں بھی ہر مذہب میں کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوتی تھی اور عرب جاہلیت میں تو کوئی اس کی بات پوچھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ اسلام نے آکر دُنیا کی تاریخ میں پہلی بار بیوہ کی عزت اور اس کے حقوق کا احساس کیا۔ مشرکانہ مذاہب میں تو بیوگی اور نحوست مترادف تھے اور بیوہ کو گھر بھر کی بدبختی کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔

Marfat.com

۶۹۹ - اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیوہ عورتیں چھوڑ جائیں اور مرنے سے پہلے ان کے بارے میں وصیت کر جائیں کہ سال بھر تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔ اگر وہ خود نکل جائیں تو جو کچھ وہ جائز طریقہ پر کریں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس آیت کی تشریح میں علماء کی مختلف رائیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ

یہ حکم اوّل تھا اس کے بعد جب آیتِ میراث نازل ہوئی اور عورتوں کا حصہ مقرر ہو چکا اور ہر عورت کی عدت چار ماہ دس دن ٹھہرا دی گئی۔ تب سے اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا۔[1]

زمانہ جاہلیت میں وفات زوج کی عدت ایک سال تھی اور اسلام میں بجائے ایک سال کے چار ماہ دس روز مقرر ہوئے مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے شوہر کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک اسے رہنے کا حق حاصل ہے اور اسی کے ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان و نفقہ بھی دیا جائے گا اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور شوہروں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں اور چونکہ یہ عورت کا حق تھا اس کو وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا، اس لیے وارثوں کو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے اور اپنا حق ورثہ کو چھوڑ دے بشرطیکہ عدت پوری ہو چکی ہو۔ اور نکاح وغیرہ سب درست تھا اور یہی مراد ہے قاعدہ کی بات سے البتہ عدت کے اندر نکلنا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا۔ عورت کے لیے اور مرد کے لیے بھی اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لیے بھی۔ پھر جب آیتِ میراث نازل ہوئی گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کو حق مل گیا۔ سو اپنے حصہ میں رہے اپنے حصہ سے خرچ کرے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔[2]

شروع اسلام میں عورت کی عدت ایک سال تھی اور عورت کے لیے کوئی میراث نہ تھی صرف یہی ایک سال کا نان و نفقہ تھا۔ آیتِ میراث کے نازل ہونے کے بعد نان و نفقہ کی وصیت کا حکم منسوخ ہو گیا اور سابقہ آیتِ عدت سے جو پہلے گزر چکی ہے ایک سالہ عدت کا حکم منسوخ ہو گیا اور آیتِ عدت اگرچہ تلاوت میں مقدم ہے مگر نزول میں

---

[1] افادات شیخ الہند [2] معارف القرآن م عثمانی

Marfat.com

موخر ہے۔

امام مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔ اصل عدت تو صرف چار مہینے دس روز ہے اس کا پورا کرنا واجب ہے اور ایک سال کی عدت حکم استحبابی ہے۔ چار ماہ دس روز کے بعد عورت کو اختیار ہے کہ چاہے سال بھر پورا کرے یا نہ کرے اس لیے اس آیت سے عورت پر ایک سال کی عدت کا وجوب نہیں بلکہ شوہروں پر ایک سال کی وصیت کا وجوب معلوم ہوتا ہے [1]

اسلام سے پہلے رسم جاہلیت

دراصل اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں رسم یہ تھی کہ شوہر کے مرجانے کے بعد عورت ایک سال تک عدت میں رہتی تھی۔ اور عورت کو وحشیانہ تکالیف پہنچائی جاتی تھیں۔ اسلام نے بیوہ کے لیے عدت چار ماہ دس روز مقرر کی۔ اور اگر حمل ہے تو پھر اس کی عدت بچہ کی پیدائش ہے خواہ کسی وقت ہو جائے۔ اور چونکہ ابتداء میراث کا قانون نازل نہیں ہوا تھا اس لیے اللہ سبحانہ نے بیوہ عورتوں کے لیے یہ حکم دیا کہ ان کے حق میں سال بھر نان ونفقہ کی وصیت کی جائے اور یہ بھی وصیت کی جائے کہ بیوہ کو سال بھر تک گھر سے نہ نکالیں اور ساتھ ہی یہ بات عورت کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی کہ اگر وہ چاہے تو رہ سکتی ہے اور چاہے تو جا سکتی ہے لیکن وارثوں کو نکالنے کا حق نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جب تک میراث کا حکم نہیں آیا تھا۔ اس وقت یہ حکم تھا کہ شوہر موت کے وقت ایک سال کے لیے نان ونفقہ اور مکان میں سکونت کی وصیت کر جائے اسی کو قرآن میں متاعاً فرمایا ہے۔ جب عورتوں کی میراث کا حکم نازل ہو گیا تو اب یہ حکم باقی نہیں رہا بلکہ عورت اپنے شوہر کے ترکہ میں سے اپنے نان ونفقہ وغیرہ کا انتظام کرے۔ وصیت کی ضرورت نہیں ہے اور یہ جو فرمایا کہ اگر خود بخود نکل جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عدت پوری کرنے کے بعد چلی جائیں تو تم پر یعنی ورثہ اور حکام پر کوئی الزام نہیں ہے۔ یہ اس کا حق ہے۔ اگر وہ فائدہ حاصل کرنا نہیں چاہتی تو نہ کرے۔ اس تقریر کی رُو سے دوسرے تمام اعتراضات کا دروازہ

---

[1] معارف قرآن ۱۲

Marfat.com

بند ہو جاتا ہے اور اس کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ ناسخ نزول میں مقدم ہے اور تلاوت میں مؤخر ہے۔ بہرحال کچھ ہو اس پر اتفاق ہے کہ اب عدّت بیوہ کی چار ماہ دس روز ہے۔ اور عورت کی میراث مقرر ہو جانے کے بعد نان و نفقہ کا حق ساقط ہو چکا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر شوہر نے وصیّت کر دی ہو کہ ایک برس تک عورت اس کے گھر میں رہے اور نان و نفقہ دیا جائے یعنی ایک سال سوگ مناتے اور گھر سے نہ نکلے جیسا کہ عرب جاہلیّت میں دستور تھا تو ایسی وصیّت اب واجب التعمیل نہیں۔ کیونکہ وفات کی مدّت چار ماہ دس دن مقرر کر دی گئی ہے۔

بہرحال بیوہ کے لیے وصیّت کا حکم وقتی تھا اور وجہ یہ تھی کہ ان آیات کے نزول کے زمانے تک میراث کا قانون نازل نہیں ہوا تھا ——— چنانچہ والدین اور اہلِ قرابت کے لیے بھی اسی پارے میں وصیّت کی ہدایت گزر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ بعد میں جب وراثت کا قانون جاری ہو گیا اور میّت کے دوسرے وارثوں کی طرح اس کی بیوہ کا بھی حصّہ مقرر ہو گیا تو جس طرح والدین اور دوسرے وارثوں سے متعلق وصیّت منسوخ ہو گئی بیوگان کے لیے بھی منسوخ ہو گئی اور اس کی جگہ وراثت کے مستقل قانون نے لے لی۔[1]

اس آیت میں فلاجناح علیکم کے خطاب میں بہت گہری معنویت ہے کہا تو یہ گیا ہے کہ اگر عورتیں خود گھر سے چلی جائیں فان خرجن۔ اور گناہ کی نفی بجائے عورتوں کے مردوں سے کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام معاشرہ اس صورتِ حال کا ذمّہ دار ہے اور شریعت و قانون کی ذمّہ داری معاشرے کے تمام افراد پر اجتماعی طور پر ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی ذمّہ داریاں کیا ہیں اور اس جماعت کا ظہور اللہ کے قانون کے نفاذ کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ اس خطاب سے یہاں یہی مقصد ہے کہ ذمّہ داری کا یہ احساس افراد اور جماعت کے دلوں میں بخوبی جاگزین ہو جائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کی ذات عزیز حکیم ہے تاکہ قلوب ہر کام میں اللہ کی قوّت اور اس کی حکمت کی جانب متوجہ ہوں یعنی یاد دلایا ہے کہ وہ بڑا قوّت والا ہے لہٰذا اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنا کتنی زبردست نادانی ہے۔ وہ حکیم ہے اس کے احکام سارے کے سارے

---

[1] تدبرِ قرآن

Marfat.com

قریب بعید، جلی وخفی مصالح بشری کے جامع ہیں۔

عام طلاق والی عورتوں کا متعہ

۷۰۰۔ اور دیکھو جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو تو چاہیے کہ ان کو مناسب طریقے پر فائدہ پہنچایا جائے۔ متقی انسانوں کے لیے ایسا کرنا لازم ہے۔

اس سے پہلے متعہ دینے کا حکم اس طلاق پر آچکا ہے کہ نہ مہر ٹھہرا ہو نہ شوہر سے خلوت ہوئی ہو اب اس آیت میں وہ حکم سب کے لیے آگیا مگر اتنا فرق ہے کہ سب کو متعہ دینا مستحب ہے ضروری نہیں اور پہلی صورت میں ضروری ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کے لیے متعہ دینے کا حکم متعوھن میں پہلے آچکا ہے مگر وہ متعہ دو قسم کی عورتوں کے لیے تھا۔

اوّل وہ جن کا مہر مقرر نہ تھا اور خلوت سے پہلے طلاق ہو گئی اس کا متعہ یہ تھا کہ سامان دیا جائے دوسری وہ کہ مہر مقرر ہو اور خلوت سے پہلے طلاق ہو گئی ہو اسے آدھا مہر دیا جائے اب یہاں باقی طلاق والیوں کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ سوم وہ جن کا مہر مقرر ہے اور خلوت کے بعد طلاق ہو گئی ان کو پورا مہر دیا جائے۔ چہارم وہ جن کا مہر مقرر نہ ہو اور خلوت کے بعد طلاق ہو گئی ہو اسے مہر مثلی دیا جائے۔ اس صورت میں متاع کے معنے مہر کے ہوں گے اور یہ واجب ہے۔ اور اگر مہر کے معنے سامان کے ہوں جیسے پہلی صورت میں ہے تو یہ صرف پہلی مطلقہ کو دینا واجب ہے اور باقی کو مستحب۔ اور اگر متاع سے زمانۂ عدّت کا نان ونفقہ مراد ہو تو جس طلاق والی عورت کی عدّت ہے زمانۂ عدّت میں اس کا نان ونفقہ واجب ہے چاہے طلاق رجعی ہو یا طلاق بائن۔ غرض آیت اپنے عموم کی وجہ سے سب کو شامل ہے [2]

بعض علماء کی رائے میں اس آیت میں وہ ہی مطلقات مراد ہیں جن کو متعہ دیا جاتا ہے اور جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور المطلقات میں الف لام عہد کا ہے یعنی جن کا مہر مقرر نہ ہوا اور طلاق خلوت سے پہلے ہو گئی۔ اس صورت میں یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ پہلی آیت کے حکم کی تائید

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] معارف القرآن

ہے۔ کیونکہ وہاں یہ کہا گیا متاعاً بالمعروف حقاً علی المحسنین جس سے یہ شبہ ہوا کہ یہ متعہ دینا محض احسان اور تبرع کے درجہ کی بات ہے واجب اور لازم نہیں ہے۔ اسی شبہ کے دُور کرنے کے لیے بطورِ تاکید یہ ارشاد ہوا ہے۔ گویا نکاح و طلاق کے احکام کا بیان ختم کرتے ہوئے ان مطلقہ عورتوں کے لیے احسان و سلوک کا مکرر حکم ہے۔ کیونکہ اس معاملہ میں رشتہ کا مردوں کے ہاتھ میں ہے اور عورتوں کا پہلو کمزور ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بار بار حسن سلوک اور عفو و درگزر پر زور دیا جائے۔ پہلے حقاً علی المحسنین کہہ کر حسن کاروں سے کہا گیا تھا کہ یہ تمہاری حسن کاری کا تقاضا ہے اور اب حقاً علی المتقین کہہ کر اس کو اہل تقویٰ پر تقویٰ کا لازمی تقاضا اور ایک حق قرار دیا ہے۔ گویا پہلے جو بات دیانت اور ایک اخلاقی تقاضا تھی اب وہی بات فیصلہ اور قانونی تقاضا ہے۔

قرآن میں جو حقوق تقویٰ کے حوالہ سے آتے ہیں وہ اس دُنیا کی زندگی میں قانون کی گرفت میں آتے ہیں اور یہ فجور کے مقابلے پر آتا ہے۔ مثلاً ایک موقعہ پر فرمایا کہ ان کا عہد پورا کرو اور ساتھ ہی فرمادیا کہ ان اللہ یحب المتقین گویا فضائلِ اخلاق کی بہم رسانی کا نام اگر احسان ہے تو اخلاقی رذائل سے دامن بچا کر رکھنے کا نام تقویٰ ہے۔ اسی لیے اسلام میں تمام عبادات کی غرض و غایت تقویٰ بتائی گئی ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعے بندہ میں خدا کی نافرمانی سے بچنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایک چیز محسنین پر حق قرار دی گئی ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کا قانون اس دُنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کوئی قانونی گرفت نہ کرے لیکن جو چیز متقین پر حق قرار دی گئی ہے تو اسلام کا قانون اس دُنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر قدغن قائم کرے گا۔ احسان اگر آخرت کی زندگی میں درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے تو تقویٰ دنیا کی زندگی میں اسلام کے شہریوں کے لیے اسلام سے وفاداری کا نشان ہے۔

۱۰۷۔ اسی طرح اللہ تم پر اپنی آیات واضح کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو اور سوچو سمجھو۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں نکاح، طلاق، عدت کے احکام بیان فرمائے ایسے ہی اپنے احکام و آیات کو واضح فرماتا ہے کہ تم سمجھ لو اور عمل کر سکو۔ یہاں نکاح و طلاق کے احکام ختم ہو چکے[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ
فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ
يَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اے پیغمبر کیا تم نے ان لوگوں کی سرگزشت پر غور نہیں کیا جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے نکل کھڑے ہوتے اور باوجودیکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔[۷۰۲] بس اللہ نے حکم دیا کہ تم مر جاؤ۔ پھر اللہ نے اُن کو زندہ کر دیا۔[۷۰۳] یقیناً اللہ انسانوں پر بڑا ہی فضل و رحمت والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔ اور دیکھو اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ تمہاری باتوں کو سننے والا اور تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔[۷۰۴] کون ہے جو اللہ کو خوش دلی سے قرض دیتا ہے تاکہ اللہ اس کا قرض دوگنا سہ گنا سے زیادہ کر کے ادا کرے اور تنگی و کشائش اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے

اور اسی کے حضور تم کو پیش ہونا ہے۔[۲۰۵]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ اس انداز سے احکام بیان فرماتا ہے کہ حکم بھی بتایا جائے حکم کی علت کی طرف بھی اشارہ کیا جائے۔ اور ان میں ذکر اللہ اور پند و نصیحت کا اس طرح پیوند لگا دیا جائے کہ اس پر عمل کے لیے آمادگی پیدا ہو جائے۔ گویا اس طریق سے قرآن اپنے مخاطبوں کی عملی اصلاح کے ساتھ عقلی تربیت بھی کرتا ہے تاکہ مخاطب اپنے دین کی حد تک صاحب بصیرت ہو اور ہر دور میں اس کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن کے احکام کا دنیا کے سامنے علمبردار ہو۔ یہاں حکیم الامت نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ ان احکام طلاق وغیرہ میں اتقوا اللہ اور حدود اللہ، سمیع علیم، عزیز حکیم، اور بصیر، خبیر اور ھم الظالمون وغیرہ تعبیرات کا اس بہتات کے ساتھ آنا۔ اس بات کی دلیل قطعی ہے کہ یہ سب احکام شریعت میں مقصود اور واجب ہیں۔ محض مشورے کے طور پر نہیں کہ ان میں ترمیم و تبدیلی کا ہمیں حق حاصل ہو۔[۱]

جہاد زندگی کی کامرانیوں کی چابی ہے۔

اب طلاق و نکاح کے احکام بیان فرمانے کے بعد سلسلہ بیان پھر اسی طرف پھرتا ہے جہاں سے نکاح و طلاق کا بیان شروع ہوا تھا۔ یعنی جہاد کے احکام و مصالح کی طرف، بات یہ بتائی جا رہی تھی کہ ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے کہ ایمان کی خاطر زندگی میں جہاد کی سرگرمیاں ہوں۔ جو لوگ ایمان میں ثابت قدمی کا مظاہرہ وطن سے بے وطن ہونے کی سختیاں برداشت کر کے اور اللہ کی راہ میں محنت اور جہاد سے کرتے ہیں یہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اب ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ جو جماعت ایمان کی مدعی ہو کر موت سے ڈرتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی۔ اسی سلسلہ میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی عبرت انگیز سرگزشت بیان ہوئی ہے جس نے باوجود کثرت تعداد کے جہاد سے بے رخی اختیار کی تھی۔ اس مقام پر اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کون لوگ تھے، کہاں تھے اور کس

---

[۱] بیان القرآن

Marfat.com

زمانے میں تھے اور کس جگہ تھے۔ قرآن کوئی تاریخی دستاویز نہیں اور اس کے جاننے پر اصل مقصد
موقوف نہیں ہے کیونکہ اصل مقصد تو عبرت و نصیحت ہے اور اس میں زمان و مکان سے
کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل منشا یہ ہے کہ زندگی اس کے ظاہری اسباب اور اس کی اصل حقیقت
کے بارے میں تصورات اور نقطہ نظر درست رکھا جائے۔ اللہ کی تقدیر پر یقین ہو، فرائض
اور ذمہ داریاں بغیر گھبرائے اور پریشان ہوئے اطمینان سے پوری کی جائیں۔ کیونکہ جو کچھ ہو
ہے وہ ہو کر رہے گا۔ موت و زندگی اللہ کے قبضے میں ہے۔ خوف اور پریشانی سے نہ زندگی
میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ موت ٹل سکتی ہے۔ اللہ ہی جان دینے والا ہے اور اللہ ہی جان
لینے والا ہے۔ بہرحال ان آیات میں اہلِ ایمان کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہے اور ان کمزوریوں
سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے جن کی وجہ سے اُمتیں زوال و انحطاط کا شکار ہو جاتی ہیں۔

۲۰۷۔ اے پیغمبر کیا تم نے ان لوگوں کی سرگزشت پر غور نہیں کیا جو اپنے گھروں
موت کے خوف سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور باوجودیکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے
پہلی اُمت کا قصہ ہے کہ کئی ہزار شخص بار ساتھ لے کر وطن سے بھاگے۔ اُن کو ڈر
غنیم کا اور لڑنے سے جی چھپایا۔ یا ڈر ہوا تھا وبا کا اور تقدیر پر توکل و اعتماد نہ کیا۔ پھر
منزل پر پہنچ کر بحکمِ الٰہی سب مر گئے پھر سات روز کے بعد پیغمبر کی دُعا سے زندہ
کہ آگے کو توبہ کریں۔ یہ واقعہ یہاں اس لیے ذکر فرمایا کہ کافروں سے لڑنے یا فی سبیل
مال خرچ کرنے میں جان و مال کی محبت کے باعث دریغ نہ کریں اور جان لیں کہ الموت
روانہ کرے تو موت سے چھٹکارا نہیں ہے۔ اور زندگی چاہے تو مُردہ کو دم کے دم میں
زندہ کر دے۔ زندہ کو موت سے بچا لینا تو کوئی چیز ہی نہیں۔ پھر اس کی تعمیلِ حکم میں
سے ڈر کر جہاد سے بچنا یا افلاس سے ڈر کر صدقہ اور دوسروں پر احسان یا عفو و فضل سے
رُکنا بددینی کے ساتھ حماقت بھی ہے[1]

اس مقام کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ مسلمان اس وقت گھروں سے
نکالے گئے تھے۔ سال سے مدینہ میں پناہ گزین تھے اور کفار کے مظالم سے تنگ آ کر خود
بار بار مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جائے مگر جب انہیں لڑنے کا

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

حکم دے دیا گیا تو ان میں سے بعض لوگ کسمسا رہے تھے اس لیے یہاں اس واقعہ کو پیش کر کے انہیں عبرت دلائی گئی ہے۔ قرآن نے جن لوگوں کا واقعہ بیان کیا ہے نہ ان کے مقام کا ذکر کیا ہے اور نہ قوم و اُمّت اور نہ ان کی پوری تعداد بتائی ہے۔ اگر یہ باتیں انسانی زندگی کے لیے مفید ہوتیں تو قرآن بیان کر دیتا اور اس موضوع پر تاریخ و روایت کے دفتر میں نبوت کی پیش کی ہوئی تشریح بھی نہیں ہے۔ مفسرین قرآن نے بہت سی باتیں لکھی ہیں لیکن ان کا سرچشمہ اسرائیلی روایات ہیں اور شاید بعض بزرگوں نے روایات کی مبالغہ آمیزی سے گھبرا کر اس کے واقعہ ہونے کا انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر نے حضرت ابن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ یہ تمثیل ہے واقعہ اور قصہ نہیں ہے محض عبرت کے لیے پیش کی گئی ہے۔

اتنی بات واضح ہے کہ یہ لوگ موت کے اندیشہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ دشمن کے حملہ کا اندیشہ تھا یا کسی وبائی بیماری کا خطرہ تھا۔ موقعہ اور مقام کا تقاضا یہی ہے کہ دشمن کا اندیشہ تھا۔ اور اُن کا یہ بھاگنا اس لیے نہ تھا کہ ان کی تعداد تھوڑی تھی۔ یہ ہزاروں یعنی بہت تھے۔ موت کے ڈر، جُبن، بزدلی، محبت دنیا کی وجہ سے وہ باوجود اکثریت کے بھاگ گئے۔ اکثریت کے باوجود چونکہ ان کا یہ طرزِ عمل بڑا ہی عجیب و غریب ہے۔ اس لیے بات کو الم تر سے شروع کیا گیا ہے، عربی میں یہ طرزِ خطاب ایسے موقع پر آتا ہے جب مخاطب کو کسی بڑے اہم، حیرت انگیز، عجیب و غریب واقعہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو۔ رویت ہمیشہ آنکھ سے دیکھنے کے معنے میں نہیں آتا بلکہ وہم و تخیل غور و فکر اور عقل کی راہ سے مطالعہ کو بھی رویت کہتے ہیں اور جب اس کا صلہ الی ہو تو کوئی مقصود، کوئی نتیجہ اخذ کرنا یا نتیجہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ان کی یہ حالت کہ باوجود کثرتِ تعداد کے جُبن، بزدلی اور موت کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ بیٹھے۔ چونکہ انتہائی حیرت انگیز بات تھی اس لیے فرمایا کہ کیا آپ نے غور نہیں فرمایا۔

اُمّت موت سے کب ڈرتی ہے

اُمتوں میں یہ حالت کب رونما ہوتی ہے۔ جب بدعات اور شرک کے غلبے سے ان کی دینی و اخلاقی حالت خراب ہو جاتی ہے اور اجتماعی تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے سیاسی شیرازہ پامال ہو جاتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بحوالہ حضرت ثوبان سنن ابو داؤد

میں آتا ہے:

قریب ہے کہ دُنیائے کُفر تمہارے خلاف ایک دوسرے کو دعوت دے جیسے کھانے والے کھانے پر دعوت دیا کرتے ہیں۔ کسی نے دریافت کیا کیا اس روز ہماری تعداد کم ہوگی۔ ارشاد ہوا کہ نہیں بلکہ بہت زیادہ تعداد میں ہوں گے لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے کوڑے کرکٹ جیسی ہوگی، اور اللہ سبحانہ، تمہارے دُشمنوں کے سینوں سے تمہارا دبدبہ ہٹا دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن پیدا ہو جائے گا۔ پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ وہن کیا ہوتا ہے؟ فرمایا دُنیا کی محبت اور موت کا ڈر اور اس کی ناگواری۔

۷۰۳۔ بس اللہ نے ان کو حکم دیا کہ تم مرجاؤ پھر اللہ نے اُن کو زندہ کیا یعنی وطن سے جان بچانے کے لیے اور حکمِ جہاد کی تعمیل سے جی چرانے کے لیے لیکن یہ تدبیر کچھ بھی کام نہ آئی اور اُلٹے موت کا شکار ہو گئے۔

یہاں موت وحیات سے کیا مراد ہے۔ عام رائے یہی ہے کہ یہاں موت زندگی کے فنا ہونے اور حیات اسی مادی زندگی کے معنے میں آیا ہے لیکن قرآن میں موت صرف اسی معنے میں نہیں بلکہ دوسرے معانی میں بھی آیا ہے۔ مثلاً نیند بے ہوشی، اخلاقی و ایمانی موت اور ویسے ہی حیات بیداری، ہوش میں آنا اور ایمانی و اخلاقی زندگی کے معنے میں آیا ہے۔ یہاں فرد کی موت وحیات کا تذکرہ نہیں بلکہ اُمت اور قوم کی موت وحیات کا تذکرہ ہے۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ چونکہ وہ بہت بڑی اکثریت کے باوجود حکمِ جہاد سے جان بچا رہے تھے اس کے نتیجے میں ان کی بزدلی کی وجہ سے دُشمن اُن پر غالب آگیا اور ایک عرصہ گزر جانے کے بعد جیسا کہ قرآن میں ثم (پھر) کی معنویت کا تقاضا ہے۔ ان کو زندگی ملی یعنی عزم وثبات کی ایسی رُوح اُن میں پیدا ہوگئی کہ دُشمنوں کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے اور دُشمن کے مقابلے میں فتح مند ہو گئے۔ گویا بتا دیا گیا کہ جو جماعت موت کو ناگوار سمجھتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی ہے۔

آیت کا یہ مطلب سیّد رضا رشید، مفتی محمد عبدہ اور مولانا آزاد نے بتایا ہے اور موقعہ ومحل کے زیادہ مناسب ہے۔ آخر میں فرمایا ہے کہ اللہ انسانوں پر بے پایاں فضل بخشش والا ہے لیکن افسوس لوگوں کو اس انعام کی قدر نہیں ہے۔

۷۰۴۔ اور دیکھو اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ تمہاری باتوں کو سنتا

Marfat.com

اور تمہارے اعمال کو جاننے والا ہے۔ حکم کی مخاطب پوری اُمتِ مسلمہ ہے لیکن خطاب بحیثیت جماعت ہے بحیثیت افراد نہیں ہے۔ کہ فرداً ہر شخص جب جی چاہے تلوار اٹھا کر چلانا شروع کر دے۔ اس تمہیدی حکایت کے بعد کہ موت و زیست سب کا سررشتہ اللہ کے قبضہ میں ہے اب حکم ملتا ہے کہ اسی کے حکم سے اسی کے دین کی خدمت کے لیے جہاد و قتال میں مشغول ہو جاؤ[1] گویا اوپر کی تاریخی تمہید کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور یقین کرو کہ اللہ سُن رہا ہے جانتا ہے۔ یعنی تمہیں دو وجہ سے جنگ کرنی چاہیے۔ ایک تو اس لیے کہ یہ جنگ اللہ کی راہ میں، قوم، وطن، زبان، نسل اور کاروبار کی راہ میں نہیں ہے اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر بندے کو اللہ کی معیت حاصل ہے دوسرے اس لیے کہ اللہ تمہاری جانبازیوں، قربانیوں، دُعاؤں اور فریادوں، اور تمہارے دُشمنوں کی چالوں اور تدبیروں سے خوب واقف ہے یہاں ان صفات کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جب اللہ سنتا ہے اور جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہاری پکار پر تمہاری مدد کو آئے گا اور تمہاری جانبازیوں کا بھرپور صلہ دے گا۔

جہاد ایمان کی کسوٹی ہے

اہلِ ایمان کو اس آیت کے ذریعہ تنبیہہ کی گئی ہے کہ اللہ کی راہ میں قربانی ہی ایمان کی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اس لیے ایمان کا دعویٰ کرنے اپنی ذاتی نیکیوں پر قانع نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ہماری نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی اور قومی مفاد کی خواہش بھی شامل ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھو اللہ کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی تم میں کتنی خواہش ہے؟ کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

جس شخص کو اس طرح موت آئے کہ نہ تو اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور نہ

---

[1] ماجدی

Marfat.com

اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت پر مرا۔
غور کیجیے آج کتنے مسلمان ہیں جن کے قلوب جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش سے معمور ہیں۔ جو لوگ ہم میں سے دیندار ہیں انہی کے دلوں کا جائزہ لیجیے۔ کیا ان میں سرفروشی اور جان نثاری کی آرزو کہیں جھلکتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش تو اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم موجودہ کافرانہ زندگی سے غیر مطمئن ہوں اور اسے بدلنے کی آرزو رکھتے ہوں وہ لوگ جہاد کی تمنا کیوں کریں جو موجودہ ماحول کی آسائشوں اور نعمتوں اور غیر اسلامی نظامات کے منافع سے استفادہ کر رہے ہوں اور نہ تو اس استفادے کو برا سمجھتے ہوں اور نہ ان نظامات سے باہر نکلنا چاہتے ہوں۔ جو لوگ غیر اسلامی نظامات اور باطل افکار و اقدار کی خدمت کرنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض روزہ نماز اور تسبیح و تہلیل کی بنا پر اپنے آپ کو خدا رسیدہ سمجھتے ہیں ان کو کیا پڑی ہے کہ حق کے قیام کی خاطر جان و مال کی قربانی دیں اور صداقت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کریں۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کی خواہش اور اس کے لیے ایثار و جاں فروشی کا جذبہ تو اس جماعت میں پیدا ہو سکتا ہے جو کافرانہ تہذیب سے بیزار اور اس کی جگہ اسلامی تہذیب کے قیام کی آرزومند ہو۔ اس کے برعکس غیر اسلامی نظامات سے ہماری دل بستگی اس قدر پختہ ہو گئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ ہم میں ان نظامات سے باہر نکلنے کی حس باقی نہیں رہی ہے بلکہ جب کبھی ان کو خطرہ ہوتا ہے ہماری تمام کوششیں ان نظامات کی حفاظت اور بقا میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ بہرحال مجاہدانہ زندگی مسلمان کی سب سے بڑی عزت ہے۔

۷۰۵۔ کون ہے جو اللہ کو خوش دلی سے قرض دیتا ہے تاکہ اللہ اس کا قرض دوگنا سہ گنا زیادہ کر کے ادا کرے اور تنگی و کشائش اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اسی کے حضور تم کو پیش ہونا ہے یعنی چاہیے کہ خرچ کرو اللہ کے راستہ میں مال اور تنگی سے نہ ڈرو، کشائش اور تنگی سب اس کے اختیار میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر سب کو جانا ہے۔

قرضِ حسنہ

قرضِ حسنہ اسے کہتے ہیں جو قرض دے کر تقاضا نہ کرے اور اپنا احسان نہ رکھے اور بدلہ نہ چاہے اور اسے حقیر نہ سمجھے اور خدا کو دینے سے جہاد میں خرچ کرنا مراد ہے یا محتاج

Marfat.com

کو دینا[1] مطلب حضرت شیخ کا یہ ہے کہ

قرضِ حسن کا لفظی ترجمہ اچھا قرض ہے اور اس سے مراد ایسا قرض ہے جو خالص نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے اس طرح جو مال راہِ خدا میں خرچ کیا جائے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے - اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل واپس کروں گا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا - البتہ شرط یہ ہے کہ قرضِ حسنہ ہو یعنی اپنی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے بلکہ صرف اللہ کی خاطر ان کاموں میں صرف کیا جائے جن کو وہ پسند کرتا ہے[2]

دراصل قرضِ حسن خالص قرآنی اصطلاح ہے اس سے مراد ہر وہ رقم ہے جو دین کی کسی مد میں خرچ کی جائے - یہاں مراد مصارفِ جہاد ہیں - اس ملی چندے کو قرض اور پھر قرضِ حسنہ سے تعبیر کرنا محاورۂ عرب کے مطابق ہے - عرب والے اچھے معاوضہ والے عمل کو اچھے قرض اور ہر بُرے معاوضہ والے عمل کو بُرے قرض سے تعبیر کرتے ہیں - عرب ایک مشہور تجارت پیشہ قوم تھی - قرض، بیع و شرا وغیرہ کے الفاظ اگر ان کی ادبی زبان کا جزو بن گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے -[3]

راہِ خدا میں خرچ کے لیے قرض کی تعبیر

یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرض سے تعبیر فرمایا ہے - قرض قرضدار کے ذمہ واجب ہوتا ہے اور یہ رب کریم کا کتنا بڑا انعام ہے کہ جو مال اس نے خود بندوں کو دیا ہے وہی مال جب ان سے اپنی راہ میں خرچ کراتا ہے - تو اس کو اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے پھر اس سے بھی زیادہ روح و دل کے لیے سامانِ راحت یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ یہ قرض اس لیے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کے دیے ہوئے ان خزف ریزوں کو خوب بڑھائے اور ان کو بڑھا کر ایک لازوال خزانہ کی صورت میں ان کو واپس کر دے یعنی اس قرض کی ضرورت ہی گویا اس لیے پیش آئی ہے کہ اس راہ سے وہ اپنے بندوں کے لیے نفع کمانے کی راہ کھول دے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک خرچ کر کے دس گنا سے سات سو گنا تک اس کا اجر حاصل کریں[4]

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو مجازاً قرض کہا گیا ہے کیونکہ قرض دینے کے معنے یہ ہیں کہ کسی

---

[1] وفاداتِ شیخ الہند [2] تفہیم القرآن [3] ماجدی [4] تدبرِ قرآن

Marfat.com

کو اپنا سرمایہ اس شرط پر دیا جائے کہ وہ پھر برابر سرابر اسے واپس کر دے۔ بندہ حقیقتہً کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے اللہ سبحانہٗ کی ملکیت ہے۔ خود بندے اس کی مخلوق اور مملوک ہیں۔ آقا کو غلام سے قرض مانگنے کی کیا ضرورت محض تلطف اور اظہارِ عنایت کی خاطر اس کا نام قرض رکھ دیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی دو گے اس کا معاوضہ ملے گا۔ جیسا کہ

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ۔

اللہ نے اہلِ ایمان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔

جان و مال کے عوض میں جنت دینے کا نام بیع و شرا خرید و فروخت رکھ دیا ہے۔ حالانکہ جان اور مال اور جنت کے مالک وہی ہیں۔ خرید و فروخت کے لیے یہ ضروری ہے کہ خریدار اور مالک کی ملک علیحدہ علیحدہ ہو۔ لہٰذا جیسے اس آیت میں درحقیقت وہی خریدار وہی مالک ہیں صرف ظاہر کے لحاظ سے بندے کو مالک اور اپنے کو خریدار مجازاً کہدیا ہے۔ اسی طرح اس گرامی قدر آیت میں سمجھ لو کہ لینے والے اور دینے والے سب وہی ہیں۔ مجازاً اس کو قرض سے تعبیر کر دیا تاکہ بندے کا دل خوش ہو جائے اور بندے کو اگر کچھ عقل ہے تو غیرت سے زمین میں گڑ جائے کہ اللہ اکبر خود اپنے فضل و کرم سے مال و دولت ہم کو دیتے ہیں اور پھر ہمارے ہاتھ میں دے کر فرماتے ہیں کہ لاؤ اس میں سے ہمیں کچھ قرض دے دو اور حکم بھی حکم کے انداز میں نہیں دیتے بلکہ بندے سے دریافت کرتے ہیں کہ بتاؤ کون ہے؟ جو اللہ کو قرض دیتا ہے؟۔

اللہ کے بندوں کی مدد اللہ کو قرض دینا ہے

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ کو قرض دینے سے مراد اللہ کے بندوں کو قرض دینا ہے چنانچہ ایک حدیثِ قدسی میں یہی حقیقت ایک مؤثر پیرائے میں واضح کی گئی ہے۔

قیامت کے روز ایسا ہوگا کہ اللہ سبحانہٗ ایک انسان سے کہے گا کہ ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہیں کی۔ بندہ حیران ہو کر کہے گا کہ بھلا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے اور تو تو رب العالمین ہے۔ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔

Marfat.com

اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابنِ آدم! میں نے تیرے سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو۔ اللہ سبحانہٗ فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا اگر تو اسے کھلاتا تو تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی اللہ سبحانہٗ فرمائے گا اے ابنِ آدم میں نے تیرے سے پانی مانگا تھا مگر تو نے مجھے پانی نہیں پلایا بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے تو تو خود پروردگار ہے۔ اللہ سبحانہٗ فرمائے گا کہ میرے فلاں پیاسے بندے نے تیرے سے پانی مانگا لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا اگر تو اُسے پانی پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ (مسلم عن ابوہریرہ)

اس سے معلوم ہوا کہ بندے کے لیے اللہ کو قرض دینے کی عملی راہ یہ ہے کہ اس کے بندوں کی اعانت و نصرت کی جائے۔

آیت پر عمل کا ایک مظہر

حضرت ابوالدحداح انصاری کا واقعہ ابنِ کثیر نے ابنِ ابی حاتم اور دوسرے مفسرین نے طبرانی اور بیہقی کے حوالہ سے اور علامہ قرطبی نے اپنی سندِ مسلسل سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت کو سن کر دریافت کیا۔ یا رسول اللہ! کیا خدا بھی قرض طلب کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ انہوں نے عرض کیا آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے۔ سرکار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا میں نے اپنا وہ باغ جو ایک چار دیواری میں ہے اور جس میں کھجوروں کے چھ سو درخت ہیں اللہ سبحانہٗ کو قرض دے دیا ہے۔ ان کے بیوی بچے بھی اس باغ میں رہتے تھے۔ حضور انور کی مجلس سے باغ دے کر اُٹھے اور باغ کے دروازے پر کھڑے ہو کر اپنی اپنی بیوی کو آواز دی۔ اور اس سے کہا کہ بال بچوں کو لے کر باغ سے باہر آجا۔ میں نے یہ باغ اللہ کو قرض دے دیا ہے۔ بلکہ علامہ قرطبی نے وہ نظم بھی نقل کی ہے جو اس مخیر صحابی نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے اس موقعہ پر کہی۔

Marfat.com

هداك ربي سبل الرشاد　　الى سبل الخيرات السداد

اے بیوی اللہ تجھے رشد و ہدایت، خیر اور صواب کی راہوں پر چلا دے۔

بيني من الحائط بالوداد　　فقد مضى قرضاً الى التناد

اس باغ سے محبت کے ساتھ جدا ہو جا　　یہ باغ قیامت تک اللہ کا قرض ہو چکا

اقرضت الله على اعتمادي　　بالطوع ولا من ولا ارتداد

یہ باغ میں نے اللہ کو بھروسا اعتماد کے ساتھ خوشی سے قرض دے دیا ہے نہ احسان ہے نہ واپسی

الارجاء الضعف في المعاد　　فارتحلي بالنفس والاولاد

صرف آخرت میں دوگنے ثواب کی امید ہے　　لہٰذا تو خود بچوں کو لے کر باہر آجا،

والبر لا شك فخير زاد　　قدمه المرء الى المعاد

آخرت کا بہترین توشہ وہ نیکی ہے　　جو آدمی خدا کی راہ میں آگے روانہ کرتا ہے

لکھا ہے کہ اہلیہ بھی زبان و ادب کی چاشنی سے مالا مال تھی۔ شوہر کی زبان سے باغ کو راہ خدا میں دینے کی خبر سن کر شوہر کو پہلے یہ کہہ کر مبارک باد دی۔

ربح بيعك، بارك الله لك فيما اشتريت

تمہاری تجارت نفع والی ہو اللہ تعالیٰ تمہارے سودے میں برکت دے

اور بعد ازیں نظم کا جواب نظم سے دیا۔

بشرك الله بخير وفرح　　مثلك اوى مالديه ونصح

تجھ کو بھلائی اور خوشی کی بشارت ہو　　تیرے جیسا ہی ایسے حوصلہ کا کام کرتا ہے

قد منح الله عيالي ومنح　　بالعجوة السوداء والزهو البلح

اللہ نے میرے بچوں کو قسم قسم کی کھجوریں دیں ہیں اگر باغ دے دیا تو کیا ہوا۔

والعبد يسعى وله ما قد كدح　　طول الليالي وعليه ما اجترح

بندہ جو کچھ کرتا ہے وہ اپنی منفعت اور آخرت کے لیے کرتا ہے۔

اس کے بعد اُن کی اہلیہ بچوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ بچے جو پھل دامنوں میں لیے ہوئے تھے وہ دامن جھٹک دیے اور جو کھجوریں بچے کھا رہے تھے انگلی ڈال کر اُن کے منہ سے نکال دیں اور بچوں سے کہا کہ اس باغ سے چلو اور اسی وقت دوسرے باغ میں منتقل ہو جاؤ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا:

اللہ ہی جانتا ہے کہ ابوالدحداح کے لیے آخرت میں کتنے بے شمار کھجور کے باغ اور کتنے شاندار محلات ہیں۔

قرآن کا ذواضعاف اکثر

اضعاف ضعف کی جمع ہے ضعف کے معنے کسی چیز میں اس کے مثل اور اس کے برابر اور ملا دینا جس کو ہم اپنی زبان میں دگنا کرنا کہتے ہیں فیضاعفہٗ لہ اضعافاً کثیرۃ کیسا بلیغ فقرہ ہے پہلے مضاعفہ سے فعل لاتے جس کے معنے ڈبل کرنے کے ہیں پھر اضعافاً کا اضافہ فرمایا جس کے معنے بہت سے دگنے اور بعد ازیں کثیرۃ فرمایا جس کے معنے بہت اور زیادہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ دگنا نہیں بلکہ بے شمار مرتبہ اس میں دگنے ملاتا رہتا ہے ارشادِ نبوت ہے، کہ اللہ تعالیٰ ایک کھجور کے برابر صدقہ کو اس طرح پالتا ہے جس طرح تم لوگ گھوڑے کے بچہ کو پالتے ہو۔ قیامت کے روز وہ کھجور کا ٹکڑا اُحد کے پہاڑ کے برابر ہو گا حساب میں جسے ذواضعاف اقل کہتے ہیں یہ اس کا مقابل ہے۔ وہاں تقسیم کرتے کرتے چھوٹا عدد نکالتے ہیں اور یہاں دوگنا دوگنا کرتے کرتے اس کو شمار سے باہر کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرضِ حسنہ والے ثواب کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔

نکتہ کی بات

آخر میں ایک نکتہ کی بات فرما دی کہ تنگی اور کشائش کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ قبض اور بسط کا مفہوم بہت عام ہے۔ ہر وہ چیز جو روکی جائے اور ہر وہ چیز جس میں کشادگی کی جائے اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔ خواہ وہ مال ہو یا عمر، برکت فی الاعمال ہو یا عمل کی توفیق، دل کی سخاوت ہو یا بخل و امساک۔ قلب کا وہ قبض و بسط جو اصطلاحِ صوفیہ ہے یا شرحِ صدر اور ضیقِ صدر ہو۔ غرض ہر چیز کا قبض و بسط اللہ تعالیٰ ہی کے حیطۂ اختیار میں ہے۔ یہاں مال کی مناسبت سے تنگدستی اور فراخ دستی کا مفہوم اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ قرآنی مفہوم بہت وسیع ہے۔

بالکل آخر میں بازگشت کا ذکر فرمایا ہے والیہ ترجعون تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ اگر خوش دلی سے خرچ کیا تو ثواب کی فراوانی ہو گی

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى اِذْ قَالُوْا
لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ
عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ
اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ
فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾

اے پیغمبر کیا تم نے اس واقعہ پر غور نہیں کیا جو موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو پیش آیا۔ بنی اسرائیل کے سرداروں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر سے درخواست[۷۲۶] کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دو[۷۲۷]۔ نبی نے کہا کہ (مجھے توقع نہیں ہے کہ تم ایسا کر سکو) اگر تمہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو یہ بات ممکن ہے کہ تم نہ لڑو[۷۲۸]۔ سرداروں نے کہا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں۔ حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے جا چکے ہیں اور اپنی اولاد سے علیحدہ ہو چکے ہیں[۷۲۹]

Marfat.com

لیکن جب ویسا ہوا کہ اُن پر جنگ فرض کی گئی تو ایک تھوڑی تعداد کے سوا سب نے پیٹھ دکھا دی اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔[۷۱۰]

اور اگر بخل کیا تو مواخذہ ہوگا۔ یہ آخری جملہ وعد اور وعید دونوں کو شامل ہے۔ وعید تو اس اعتبار سے کہ جس زندگی کی خاطر مال میں بخل سے کام لے رہے ہیں۔ یہ زندگی تو چند روزہ ہے اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جس کی واقعی اور اصلی فکر ہونی چاہیے اور وعد اس لحاظ سے کہ بہتر یہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں دادِ شجاعت اور دادِ سخاوت دے کر خدا کے حضور پیش ہو تاکہ وہ تمہیں اپنے بے پایاں انعامات سے نوازے۔

جہاد کی خاطر مطالبہ قیادت

یہ واقعہ بھی اسرائیلی تاریخ کا ہے جیسا کہ پہلا واقعہ ان کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے چن کر اس موقعہ پر ان دو واقعات کو اس لیے پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کے لیے ایک سرمایہ بن جائے اور دعوتِ اسلامی کے کامیاب بنانے میں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

دوسرا واقعہ بنی اسرائیل کے اس دور سے متعلق ہے جب وہ حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد اقتدار و عزت سے محروم ہو چکے تھے، دشمنوں کے سامنے ذلیل ہو چکے اور ہدایت ربانی سے انحراف کے نتیجے میں مصائب کا شکار تھے۔ اس وقت بنی اسرائیل بنی اسماعیل کی چیرہ دستیوں کا شکار تھے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ کے عہد میں تقریباً ۱۵۰۰ ق م بنو اسماعیل تمام حجاز میں یمن سے شام تک پھیل گئے تھے۔ حضرت موسیٰ کے بعد قضاۃ بنی اسرائیل کے زمانے تقریباً ۱۲۰۰ قبل مسیح میں وہ عمالقہ و اہلِ مدین کے پہلو بہ پہلو سپاہیانہ جوہر کے ساتھ بنی اسرائیل پر چھاپہ مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سات برس تک لگاتار بنی اسرائیل اسماعیلیوں کے پنجہ میں گرفتار رہے۔ سال میں جب فصل تیار ہوتی اسماعیلی برق و باد کی طرح آتے اور سب کاٹ کر لے جاتے۔ آٹھویں برس بنی اسرائیل میں جدعون نامی ایک پہلوان پیدا ہوا۔ اس نے

Marfat.com

اسماعیلیوں کو شکست فاش دی۔ طالوت کے عہد میں غالباً ۱۰۵۰ قبل مسیح میں بنو اسماعیل حجاز سے نکل کر بادیہ شام اور بادیہ عراق تک پھیل گئے تھے عموماً مورخین عرب کا بیان ہے کہ مکہ اور حجاز میں جب اسماعیل کی اولاد زیادہ ہو گئی تھی تو نجد و حدود عراق وغیرہ میں پھیل گئی۔ اس کی تائید روایاتِ یہود سے بھی ہوتی ہے۔ اسی زمانہ کا یعنی حضرت موسیٰ سے کوئی تین صدی بعد اور حضرت داؤد سے کچھ ہی قبل کا یہ واقعہ ہے۔ بنی اسماعیل نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔

۷۰۶۔ اے پیغمبر کیا تم نے اس واقعہ پر غور نہیں کیا جو موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو پیش آیا۔ بنی اسرائیل کے سرداروں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی۔ سرداروں کے لیے اصل ارشاد الملاء آیا ہے۔ ملاء مطلق جماعت نہیں اہل حل و عقد یا اہل الرائے کی جماعت ہے توریت میں اس موقع پر اسرائیلی بزرگ ہے اس وقت بنی اسرائیل کے بنی حضرت شموئیل ہیں ۱۱۰۰ تا ۱۰۲۰ ق م ملک شام قدیم ایک کوہستانی علاقہ افرائیم کے نام سے تھا۔ اس کے شہر رامہ میں رہتے تھے۔ قرآن کی آیت بتا رہی ہے کہ گرے پڑے لوگوں اور پست قوموں میں جب زندگی کی دوبارہ امنگ پیدا ہوتی ہے تو اس کا آغاز عوام سے نہیں بلکہ خواص سے ہوتا ہے۔ یہاں قرآن نے الملاء سے اسی طرف اشارا کیا ہے۔ ملاء سے مراد قوم کے اشراف و اعیان اور اکابر و سادات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قوم کے اشراف و اعیان ہوتے ہیں جو قوم کی چوپالوں، پنچایتوں، مجلسوں، کونسلوں اور اس کے درباروں کو پُر کرتے ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کے اہلِ فکر و نظر نے اپنے وقت کے پیغمبر سے درخواست کی تھی یعنی احوال کی تبدیلی کا احساس اولاً ان میں پیدا ہوا تھا جیسے ملک و قوم میں تباہی اور بربادی کا نقطہ آغاز قوم کے اشراف و اعیان ہوتے ہیں ایسے ہی قوم کی اصلاح کا مبداء بھی خواص ہوتے ہیں جب تک خواص میں تبدیلی کا احساس نہ ہو کامیابی نہیں ہوتی۔

سیاسی نظام کی تجویز

۷۰۷۔ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دیجئے۔ حضرت سموئیل سے بنی اسرائیل کے اعیان و اشراف نے درخواست کی۔ ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دیجئے۔ اصل ارشاد میں لفظ ملک آیا ہے۔ عربی زبان میں اس کے معنے

Marfat.com

میں بڑی وسعت ہے۔ ہر صاحبِ قوت و اقتدار جو اپنے احکام و قوانین نافذ کر سکے مِلک ہے۔ اور یہاں ملک سے مراد امیر جیش یا سالارِ لشکر ہے اور یہی سیاق کے مطابق ہے۔ توریت میں اس موقعہ پر بادشاہ آیا ہے اور اسرائیلی تخیل میں بادشاہ کے لیے فوج کی سرداری لازمی تھی اور ہر سردار اعلیٰ کو بادشاہ کہتے تھے جیوز انسائیکلو پیڈیا میں ہے بادشاہ کا پہلا فرض یہ تھا کہ فوج کی امارت اور سپہ سالاری کرے (ج ۷، ص ۵۰۱) اور یہ تصریح بھی ہے کہ فلسطین میں تقریباً ہر بڑا سردار بادشاہ کہلاتا تھا (ج ۷، ص ۵۰۰) توریت میں اسی موقع کا بیان ان الفاظ میں ہے "تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اسے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کیا کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے، ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو، تاکہ ہم اور سب گروہوں کی طرح ہوں اور ہمارا بادشاہ عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہمارے لیے لڑائی کرے۔ (سموئیل ۸، ۱۹، ۲۰)[1]

خلافت اور ملوکیت

بعض معاصر مفسرین کو بنی اسرائیل کی بارگاہ نبوت میں اس درخواست پر کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو۔ بہت بڑی حیرت ہوئی اور ان کو یہ انکشاف کرنا پڑا کہ اس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیت آچکی تھی اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہی کا فرق ان کے ذہنوں سے نکل گیا تھا اس لیے انہوں نے درخواست جو کی وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں بلکہ ایک بادشاہ کے تقرر کی تھی۔

یہ بات چند وجوہ سے محتاج تنقیح ہے

۱۔ قرآن نے ایک موقعہ پر بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کی ایک تقریر کے حوالہ سے دو نعمتوں کی یاددہانی کرائی ہے ایک نبوت، دوسرے بادشاہت، چنانچہ ارشاد ہے۔

یا قوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا۔ وآتاکم

---

[1] تفسیر ماجدی

Marfat.com

مالم یوت احدا من العالمین۔

یاد کرو اے میری قوم اللہ کی اس نعمت کو کہ اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کیے اور تم کو بادشاہ بنایا اور وہ کچھ دیا جو دُنیا میں کسی کو نہیں دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبوّت اور حکومت دونوں اللہ کی نعمتیں ہیں اور اللہ نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت یوسف کے زمانہ میں اور ان کے بعد بنی اسرائیل کو مصر میں حکومت ملی۔ مدّتِ دراز تک یہی اس زمانہ کی مہذّب دُنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے۔ اور ان کا سکہ ان اطراف میں رواں تھا۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ بنی اسرائیل کی یہ درخواست کہ ہمارے لیے بادشاہ مقرر کر دو۔ ان کی جاہلیت سے متاثر ہونے کی وجہ سے تھی کچھ دُرست نہیں ہے کیونکہ جس چیز کو خود قرآن اللہ سبحانہ، کی نعمت قرار دیتا ہے۔ اس کو اہلی تاثر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۲۔ ملک صاحبِ اختیار و اقتدار کو کہتے ہیں۔ یہ اختیار و اقتدار دونوں طرح کا ہو سکتا ہے پابندِ شریعت بھی اور شریعت سے بے پروا اور آزاد بھی۔ نبوّت کے دامن سے وابستہ پابندِ شریعت اللہ کی نعمت ہے۔ بنی اسرائیل نے وقت کے پیغمبر سے اسی کی درخواست کی ہے۔ اگر نبوّت سے باغی اور شریعت سے آزاد اقتدار کی یہ درخواست ہوتی تو بارگاہِ نبوّت میں پیش نہ ہوتی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ حضرت سموئیل کے تقرر سے اس بادشاہ کا تقرر ہوا اور توریت کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوّت ہی کی ہدایات اور نبوّت ہی کی دعاؤں کے زیرِ اثر یہ بادشاہ تقرر کے بعد اپنے سارے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ بادشاہ کی درخواست بنی اسرائیل کے جاہلیت سے متاثر ہونے کی نشانی ہے کچھ وزن نہیں رکھتا ہے

بنی اسرائیل کا تو مجھے پتہ نہیں مگر یہ کہہ کر ہم اپنے مخاطبوں کو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ معاذ اللہ ہم میں تو بات کرنے کی جرأت ہے لیکن یہ جرأت بنی اسرائیل کے اس جلیل القدر پیغمبر میں نہ تھی۔

۳۔ وہی مصر جس کی حکومت دماغوں میں فرعونیت پیدا کرنے کی سبب بنتی رہی اور آج تک اس کا یہی حال ہے لیکن جب یوسف علیہ السلام کو اسی فرعونی حکومت کی سرزمین پر اقتدار و اختیار عطا کیا گیا تو اللہ کا یہ پیغمبر انعام ملتے ہی یہ آرزو کرتا ہے۔

فاطر السموٰات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلماً

والحقنی بالصالحین۔

قرآن نے حضرت سلیمان و حضرت داؤد کا چہرہ ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اس لیے لفظ بادشاہ کوئی قابلِ نفرت چیز نہیں ہے۔ قابلِ نفرت تو وہ کردار و عمل ہے جو نبوت سے بغاوت کر رہا ہو۔ خلافت بھی اگر نبوت سے بغاوت کر جائے تو اس کا مقام بھی یہی ہے۔ بادشاہ اچھے اور بُرے دونوں ہوتے ہیں۔ ایک بادشاہ وہ بھی تھا جس نے حضرت موسیٰ سے مقابلہ کیا اور ایک بادشاہ حضرت موسیٰ بھی ہیں۔ قرآن کی سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے نام سے جس تمثیلی واقعہ کا ذکر ہے میرے نزدیک اس واقعہ کے بارے میں یہ سوال کہ ذوالقرنین کون تھا؟ کہاں تھا اور کب تھا؟ غیر ضروری ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کی اس میں بات یہ ہے کہ ایک ایسا بادشاہ جسے اتنا بڑا اقتدار عطا کیا گیا کہ گویا مطلع الشمس اور مغرب الشمس تک وہ پہنچ گیا اور اتنی مختلف زبانیں بولنے والی قوموں پر اس کو حکومت دی گئی اور سائنسی وسائل کی اتنی فراوانی کہ لوہے کی اینٹیں بنا کر بجائے گارے کے رانگ پگھلا کر دیوار بنائی۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اس سائنٹفک دیوار کی تعمیر سے جب فارغ ہوئے تو بجائے کسی کبر و ناز کے اپنی بندگی کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا

هذا رحمة من ربی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک سیاسی نظام میں اصل اہمیت اس کی صورت کی نہیں بلکہ اس کی رُوح کی ہے۔ اگر اس کی رُوح خدا اور رسول کے قانون کے تابع ہے تو وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ اگر رُوح خدا اور رسول کی باغی ہے تو وہ قابلِ مذمت ہے عام اس سے کہ وہ ملوکیت ہو یا جمہوریت[1]

حضرت سموایل کا شبہ

۱۰۸۔ نبی نے کہا کہ مجھے توقع نہیں ہے کہ تم ایسا کر سکو اگر تمہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو یہ بات ممکن ہے کہ تم نہ لڑو۔ یہ بات حضرت سموایل نے کچھ تو اپنی فراستِ ایمانی اور کچھ اپنی قوم کی افتادِ طبع کے تجربوں کی بنا پر فرمائی یعنی ان کو معلوم تھا کہ بنی اسرائیل کے تنزل کا

---

[1] تدبرِ قرآن

Marfat.com

باعث یہ نہیں ہے کہ وہ قیادت سے محروم ہیں یا میدانِ جنگ میں اُن کی کمان کرنے والا کوئی نہیں ہے، بلکہ ان کی تمام نکبتوں، پستیوں اور شکستوں کا باعث یہ ہے کہ خطرناک حالات کا سامنا کرنے کے لیے ان میں قوتِ ایمانی نہیں ہے۔ اس وجہ سے حضرت سموایل نے ان کے اس مطالبہ کی صداقت کو شک کی نگاہوں سے دیکھا اور اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ تورات میں ہے — لیکن وہ کلام جو انہوں نے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو حاکم ہو۔ سموایل کی نظروں میں بُرا معلوم ہوا۔ اور سموایل نے اللہ سے دُعا کی۔ خداوند نے سموایل سے کہا کہ لوگوں کی آواز پر اور اُن کی ساری باتوں پر جو تجھے کہیں کان دھر کہ انہوں نے تجھ کو حقیر نہیں کیا بلکہ مجھے حقیر کیا ہے۔ (سموایل ۸-۶-۷)

لیکن قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے اس مطالبے پر حضرت سموایل کا جو جواب نقل کیا ہے، وہ اس سے جدا اور بنی اسرائیل کی عادات و رسوم کے عین مطابق ہے۔

قرآن حکیم میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت سموایل سے بادشاہ کے تقرر کی درخواست کی تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ "مجھے اندیشہ ہے کہ ایسا نہ ہو جب تم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیا جائے اور وہ تم کو دشمنوں سے مقابلہ کے لیے جہاد کا حکم دے تو تم بزدل ثابت ہو اور جہاد سے انکار کر جاؤ۔

بنی اسرائیل کا جواب

۷۰۹۔ سرداروں نے کہا کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنی اولاد سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ یعنی وہ بولے کہ واہ کہیں یہ بھی ممکن ہے کہ ہم نہ لڑیں۔ حکمِ شرعی سے قطع نظر ہم لوگ انتہائی مظلوم ہیں۔ اس زمانے میں فلسطینیوں کی جو شدید اور بے پناہ یورش اسرائیلیوں پر جاری تھی اور اسرائیلی کا ملک جس بے اندازہ حد تک ان کے ہاتھوں تاراج ہو رہا تھا اس کی تفصیلات قدیم اسرائیلی مورخ جوزیفس کے صفحات اور یہود کی دوسری تاریخوں میں ملتی ہیں، توریت بھی ان معرکہ آرائیوں سے بالکل خالی نہیں ہے۔ ایک جگہ ہے۔ اور جب وہ باہم مقابل ہوئے تو اسرائیل نے فلسطینیوں سے شکست پائی اور انہوں نے ان کے لشکر میں سے قریباً چار ہزار آدمی مارے اور دوسری جگہ سو فلسطینی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی۔ اور ہر ایک اپنے اپنے خیمہ کو بھاگا اور وہاں نہایت خونریزی ہوئی کہ تیس ہزار اسرائیلی مارے گئے اور خدا کا صندوق لوٹا گیا (سموایل ۴-۱۰)[1] وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کے بعد تین

[1] ماجدی

Marfat.com

سال تک بنی اسرائیل کا کوئی باقاعدہ مضبوط سیاسی نظام قائم نہ ہو سکا بلکہ قبیلوں اور خاندانوں میں سردار حکومت کرتے تھے اور ان کے مناقشات اور معاملات کے فیصلے قاضی انجام دیتے۔ اور نبی ان تمام امور کی نگرانی کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت و تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ان قاضیوں میں سے کسی قاضی کو منصبِ نبوت عطا ہو جاتا اور اس تمام عرصہ میں بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران اور اسی لیے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں۔ اور بنی اسرائیل اُن کا نشانہ بنتے رہتے تھے کبھی فلسطینی چڑھ آتے، کبھی مدیانی حملہ آور ہوتے اور ان میں سے اگر کسی حملہ آور کو ہزیمت ہو جاتی پھر بھی وہ آئے دن چھاپے مارتے رہتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اس صورتِ حال سے تنگ آکر بنی اسرائیل کے اشراف و اعیان کو اپنا سیاسی نظام بنانے کی فکر لاحق ہوئی اور حضرت شموایل سے بادشاہ بنانے کی درخواست کی حضرت شموایل نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جب تم پر کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے اور وہ تم کو دشمنوں کے مقابلہ میں جہاد کا حکم دے تو تم بزدل ثابت ہو۔ بنی اسرائیل نے بڑی قوت اور گرمجوشی سے جو جواب دیا ہے قرآن نے اس کو یہاں نقل کیا ہے۔ بولے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جہاد سے انکار کریں جب کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو دشمنوں نے بہت زیادہ ذلیل کیا ہے۔ انہوں نے ہم کو ہمارے گھروں سے نکالا اور ہماری اولاد کو قید کر لیا۔

بنی اسرائیل کا جہاد سے فرار

۱۰۷۔ لیکن جب ایسا ہوا کہ ان پر جنگ فرض کی گئی تو ایک تھوڑی تعداد کے علاوہ سب نے پیٹھ دکھا دی اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ یعنی حضرت شموایل کا کہا بنی اسرائیل کے آگے آیا۔ اور بنی اسرائیل اتنے دعووں کے باوجود پست ہمت اور بزدلی کا شکار ہو گئے جوزیفس کی مشہور تاریخ یہود میں ہے۔ ان پر دہشت طاری ہو گئی۔ یعنی پہاڑوں میں چھپ گئے۔ بعض نے زیرِ زمین غاروں میں پناہ لی اور بہت سے لوگ تو اپنا ملک چھوڑ کر دریائے یردان عبور کر گئے (باب ۶ فصل ۶) گویا حضرت شموایل کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ انہوں نے تو اللہ کی ہدایت کے مطابق ان کے لیے امیر بھی مقرر کر دیا جیسا کہ آگے آرہا ہے اور جہاد کا حکم بھی دے دیا لیکن بنی اسرائیل نے اپنی عادت کے مطابق

Marfat.com

گریز پائی اختیار کی۔ آگے تفصیلات آرہی ہیں۔

کچھ اجتماعی قوانین

اس سے معلوم ہوا کہ جس گروہ میں صبر و استقامت کی سچی رُوح نہیں ہوتی۔ اس میں بسا اوقات سعی و عمل کے ولولے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو بہت کم نکلتے ہیں جو راہِ عمل میں ثابت قدم رہنے والے ہوں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہٗ نے قوموں اور اُمتوں کے مزاج میں یہ بات رکھی ہے کہ جب ان کی اجتماعی زندگی اور آزادی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور کوئی طاقتور ان کو غلام بنانے کے خیال سے ظالمانہ رویہ اختیار کرتا ہے تو اپنے اس حق کی حفاظت اور ظالم کے دفاع کے لیے تشتت و افتراق چھوڑ کر اتحاد و اتفاق کی جانب متوجہ ہو جاتی ہیں اور اپنے لیے ایک سیاسی تنظیم کی تلاش شروع کر دیتی ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کا حضرت سموئیل سے یہ مطالبہ کہ ہمارے لیے بادشاہ مقرر کرو۔ اسی فطری تقاضے کے تحت ہے۔

قرآن نے جہاد کا ایک بنیادی مقصد فی سبیل المستضعفین بھی بتایا ہے۔ اسی کو فقہاء کی زبان میں دفع الشر عن العباد کہتے ہیں۔ بنی اسرائیل اعلاء کلمۃ اللہ کی حد تک نبوت کی رہنمائی میں زندگی بسر کر رہے تھے لیکن دفع الشر عن العباد کی حد تک وہ بے چینیوں کا شکار تھے اور صرف اسی مقصد کے تحت وہ سیاسی تنظیم بنا کر مدافعت کرنا چاہتے تھے جیسا کہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا کی تعبیر بتا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر مسلمان کسی وقت نبوت کی رہنمائی میں بھی زندگی بسر کر رہے ہوں اور اُن کی دینی زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہو لیکن ظلم و جور، استبداد اور چیرہ دستی ان کو اگر آنکھیں دکھا رہی ہو تو خالص چیرہ دستی کے مٹانے کی خاطر لڑنا بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

حضرت موسیٰ کے بعد کچھ عرصہ بنی اسرائیل کا کام دُرست رہا پھر جب ان کی نیت بگڑی تب ان پر ایک غنیم کافر بادشاہ جالوت نامی مسلط ہوا۔ ان کو شہر سے نکال دیا اور لوٹ لیا اور ان کو پکڑ کر بندہ بنا لیا۔ بنی اسرائیل بھاگ کر بیت المقدس میں جمع ہوئے۔ اس وقت شموایل پیغمبر تھے ان سے درخواست کی کہ کوئی بادشاہ ہم پر مقرر کر دیجئے کہ اس کے ساتھ ہو کر ہم جہاد کریں، فی سبیل اللہ۔

Marfat.com

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا
أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ
سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً
فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

اور اُن سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو حکمران مقرر کیا ہے۔ وہ بولے ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ اُسے ہم پر حکمرانی مل جائے حالانکہ ہم اس سے کہیں زیادہ حکمران ہونے کے حقدار ہیں۔ اور پھر اُس کو مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں۔ پیغمبر نے یہ سُن کر فرمایا کہ اللہ نے طالوت ہی کو حکمرانی کے لیے تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے۔ اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اُسے وسعت دی ہے۔ اور حکمرانی تمہارے دینے سے کسی کو نہیں مل سکتی اللہ جسے چاہتا ہے حکمرانی عطا فرماتا ہے۔ اللہ اپنی قدرت میں بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

طالوت کی قیادت و فرماں روائی

حضرت سموئیل نے جب بنی اسرائیل پر حجت پوری کر دی تو اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں

Marfat.com

درخواست پیش فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ بنی اسرائیل کی درخواست منظور ہوئی اور ہم نے طالوت کو جو علمی اور جسمانی طور پر تم سے ممتاز ہے۔ تم پر بادشاہ مقرر کیا۔ بنی اسرائیل نے جب یہ سُنا تو ان کو یہ فیصلہ ناگوار ہوا اور ناگواری کا اظہار اعتراض کی صورت میں کیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصہ سے نبوت کا سلسلہ سبطِ لاوی میں اور حکومت و سرداری کا سلسلہ سبطِ یہودا میں چلا آتا تھا تو اب جبکہ سموئیل علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق یہ شرف بنیامین کی طرف منتقل ہونے لگا تو بنی اسرائیل کے ان سرداروں کو حسد پیدا ہوا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے۔ شروع میں کسی بات کو مان لینا اور وقت پر انکار کر دینے کی یہ ادا بنی اسرائیل کی زندگی کا طغرائے امتیاز بن چکی تھی اس لیے یہاں بھی کار فرما رہی کیونکہ وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ حضرت سموایل کی نظرِ انتخاب بہرحال ہم ہی میں سے کسی پر پڑے گی۔ اس لیے جب انہوں نے خلافِ توقع بنیامین کے گھرانے سے ایک غریب مگر قوی اور عالم انسان کو اس منصب پر مامور دیکھا تو حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور بحث شروع کر دی۔ ان آیات میں اسی کو حسین طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔

حضرت سموایل کا چہرہ

۱۱۷ ۔ اور اُن سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا۔ یہاں بھی پیغمبر سے حضرت سموئیل علیہ السلام مراد ہیں۔ اشموئل عبرانی لفظ ہے اور عربی میں اس کا ترجمہ اسماعیل ہوتا ہے اور کثرتِ استعمال سے اشموئیل، شموئیل رہ گیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ شموئیل حضرت ہارون کی نسل سے ہیں۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے۔ سموایل بن حنہ، بن عاقر ادبہ کی کڑیاں مذکور نہیں اور امام مقاتل کے بیان کے مطابق یہ نسب ہے سموایل ابن بالی بن علقمہ بن یرنام بن بہومین تہو بن صوف بن علقمہ بن یاحث ابن عموص ابن عزاما۔ تورات میں بھی نسب نامہ اس کے لگ بھگ ہے۔ جو یہاں علقمہ ہے وہ تورات میں القانہ ہے۔ ان کی ولادت کا واقعہ بھی کچھ عجیب و غریب بیان کیا ہے۔ حضرت سموایل کے نام سے دو صحیفے تورات میں موجود ہیں۔ پہلے صحیفہ میں آپ کی نبوت طالوت کی بادشاہی، حضرت داؤد کا جالوت کو قتل کرنا اور طالوت کی وفات تک کے واقعات مذکور ہیں اور اس میں کل ۳۱ باب ہیں۔ دوسرے صحیفہ میں طالوت کی وفات کے بعد حضرت داؤد کی حکومت اور طالوت کے بیٹوں سے ان کی لڑائی کے احوال مذکور ہیں اور اس میں ۲۴ باب ہیں[1]۔ اور سید رشید رضا

---

[1] حاشیہ اظہار الحق

Marfat.com

رقم طراز ہیں کہ ان دونوں کی تاریخی اور روایتی حیثیت مشکوک ہے کیونکہ خود یہودیوں کو بھی ان دونوں صحیفوں کے کاتبوں کا پتہ نہیں ہے اور نہ ان کو یہ معلوم ہے کہ ان کا زمانہ کتابت کون سا ہے صرف نام کی نسبت کسی کتاب کی صحت کی ضمانت نہیں ہے [1]

طالوت کا چہرہ

۲۴۷ - اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو حکمران مقرر کیا ہے - طالوت ابن کش تاریخ میں بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ تسلیم کیے گئے ہیں - زمانہ حکومت ۱۰۲۸ تا ۱۰۱۲ ق م ہے - ان کا نام توریت میں ساول آیا ہے - تورات میں ان کے نصب حکومت کا تذکرہ بڑا طویل ہے اور خداوند نے شاول کے زمانے سے پہلے سموئیل کے کان میں کہہ دیا تھا کہ کل اسی وقت میں ایک شخص بنیامین کی سرزمین سے تیرے پاس روانہ کروں گا تو اس پر تیل ملیو کہ میری قوم اسرائیل کا حاکم ہو تاکہ میرے لوگوں کو فلسطینیوں کے ہاتھ سے چھڑائے - سو جب سموایل ساول سے دوچار ہوا تو وہیں خداوند نے کہا کہ دیکھ یہی شخص ہے جس کی بابت میں نے تجھے کہا تھا یہی میرے لوگوں پر ریاست کرے گا - (سموئیل ۹ - ۱۵، ۱۶) [2]

طالوت کا نام بائبل میں ساول ہے - یہ قبیلہ بن یمین کا ایک ۳۰ سالہ نوجوان تھا بنی اسرائیل میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی شخص نہ تھا اور ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کاندھے تک آتے تھے - اپنے باپ کے گم شدہ گدھے کو تلاش کرنے نکلا تھا - راستہ میں جب سموایل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے مقرر کیا ہے [3]

اسے طالوت کیوں کہتے ہیں؟ کچھ عجب نہیں کہ اپنے غیر معمولی قد و قامت کی وجہ سے وہ لوگوں میں اس لقب سے مشہور ہو گئے ہوں - عربی اور عبرانی دونوں زبانیں قریب قریب ہیں - اس وجہ سے دونوں میں بہت سے مادے مشترک ہیں - گمان ہوتا ہے کہ تورات نے ان کا ذکر نام سے کیا ہے اور قرآن نے لقب سے - ورنہ پھر ماننا پڑے گا کہ ان کے نام کے بارے میں تورات کا نام غلط ہے اصل نام طالوت ہی ہے [4]

---

[1] تفسیر المنار [2] ماجدی [3] تفہیم القرآن [4] تدبر قرآن

Marfat.com

تورات میں طالوت کے حلیہ کی تفصیلات بھی بتاتی ہیں۔

"بہت خوب جوان تھا اور بنی اسرائیل کے درمیان اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نہ تھا۔ (سموئیل ۹-۱۰) اور وہ جب جماعت کے درمیان کھڑا ہوتا تو شانوں سے لے کر اوپر تک سب لوگوں سے زیادہ لامبا تھا۔ (سموئیل ۱۰، ۱۳) اور دراز قامتی اسرائیلیوں کے ہاں کوئی معمولی صفت نہیں، بڑی اہم اور ضروری صفت سرداری کے لیے تھی۔ توریت کے بعد ان کے ہاں کا مقدس ترین نوشتہ تالمود ہے۔ اس میں تصریح ہے خداوند تبارک وتعالیٰ اپنی سکینت کا نزول اس شخص پر کرتا ہے جو دراز قد ہو، دانشمند ہو، مضبوط ہو، متمول ہو۔

قرآن حکیم کی اس بلاغت کے قربان جائیے کہ اس نے نام ہی ایسا رکھا جس سے بلند قامتی کی طرف اشارا ہو جائے۔[1]

اس آیت نے یہ بات کھول دی کہ طالوت کا تقرر بواسطہ نبوت اللہ کی جانب سے ہوا ہے یعنی حضرت سموئیل نے اللہ کی جانب سے بنی اسرائیل کو طالوت کے تقرر کی خبر دی ہے۔

بنی اسرائیل میں نسلی تعصب

۲۴۷۔ وہ بولے ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ اسے ہم پر حکمرانی مل جائے حالانکہ اس سے کہیں زیادہ ہم حکمران ہونے کے حقدار ہیں۔ اور پھر اس کو مال و دولت بھی حاصل نہیں۔ بنی اسرائیل کے اپنے مطالبہ پر جب سموئیل نے سالار کے تقرر کی اللہ کی جانب سے اطلاع دی تو بجائے اس کے کہ خوشی سے اس کو قبول کرتے۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس تقرر پر اعتراض کر دیا کہ یہ ہمارا سردار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ تو اس منصب کے ہم خود حقدار ہیں[2] مقصود نبی کی تکذیب نہ تھی بلکہ ان کے اس تقرر کی اطلاع پر اعتراض حیرت و تعجب کو ظاہر کرنے کے لیے تھا۔ ایک خاص قبیلہ کی جانب سے اعتراض و انکار کا ذکر توریت میں بھی ہے، "نبی بعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا اور اُس کی تحقیر کی اور اُس کے لیے نذرانے نہ لائے۔ (سموئیل ۱۰، ۲۷)

بنی اسرائیل حضرت یعقوب کی بارہ اولادوں کی نسل میں نسلی بنا پر ۱۲ فرقوں یا قبیلوں

---

[1] ماجدی [2] تدبر قرآن

Marfat.com

میں بٹے ہوتے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹا قبیلہ بن یامین کا تھا اور تورات میں تصریح ہے کہ طالوت اسی قبیلے سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی اُن کے حقیر سمجھے جانے کی، چنانچہ حضرت سموئیل نے ان کے تقرر کا اُن سے ذکر کیا تو انہوں نے بڑی خاکساری سے یہ الفاظ بیان کیے کہ

کیا میں بن یمینی یعنی بنی اسرائیل کے سب سے چھوٹے قبیلہ سے نہیں ہوں اور کیا میرا گھرانہ بن یمینی کے قبیلہ کے سب گھرانوں میں سب سے چھوٹا نہیں۔ (سموئیل ۹:۲۱)

نسل و خاندان کی اہمیت جب جائز حدود سے بڑھ جاتی ہے تو ہندوؤں کی طرح ذات پات کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اسرائیلیوں کا بھی یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ نبوت حق مخصوص ہے بنی لاوی کا اور حکومت حق ہے قبیلہ بنی یہودا کا۔ جیسے آج عام ہندوؤں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص جو برہمن نہ ہو چھتری نہ ہو وہ حاکم اعلیٰ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

کیا خلافت قریش کا حق ہے

مشہور ہے کہ خلافت میں دوسری شرائط کے ساتھ قریشی ہونا بھی ایک شرط لازم ہے لیکن کیا واقعی اسلام کا مطالبہ یہ ہے۔ جہاں تک قرآن و سنت، آثار صحابہ اور تمام دلائل شرعیہ کا تعلق ہے کوئی نص قطعی موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ اسلام نے معاملہ خلافت و امامت کو صرف قریش کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ احادیث اس بارے میں جس قدر موجود ہیں سب صحیح ہیں، یہ بھی مروی ہے کہ حضرت ابو بکر نے مجمع صحابہ میں اس کو [illegible] کسی نے انکار نہیں کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ صحابہ میں ہمیشہ اس بات کی شہرت رہی، اور یہ بھی غلط نہیں ہے کہ جب تک خاندان عباسیہ باقی رہا لوگ اس کو بطور ایک شرط سمجھتے رہے لیکن ان ساری باتوں کی وہ حقیقت نہیں ہے جو اب سمجھی جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے سچ ہونے کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے اسرائیلیوں کی طرح خلافت کو نہ کسی قوم میں مخصوص کیا ہے اور نہ کسی خاندان میں۔ اسلام جو اس طرح کے تمام نسلی امتیازات مٹانے اور ہمیشہ کے لیے صرف ایمان کی بے قید و عام عظمت قائم کرنے اور عمل کے قانون الٰہی کے آخری اعلان کے لیے آیا تھا۔ اس کے نام سے ساری باتیں مانی جا سکتی ہیں لیکن اس کا وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ اس نے خاندان و نسل کا کوئی امتیاز تسلیم کیا ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ امتیاز

Marfat.com

نسب کے جس بُت کو خود اس نے توڑا ہو اسی کے ٹکڑوں کو پھر جوڑ کر از سرِ نو ایک نیا بُت خانہ قائم کر دے۔ اس پر تفصیلی بحث کے لیے آپ کو کافی انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہو گی انشاء اللہ اس کے تفصیلی مباحث آپ کو ۲۶ پارے میں ملیں گے۔

بہرحال اسرائیلیوں کا پہلا اعتراض نسلی تعصب کی بنیاد پر تھا۔ دوسرا اعتراض ان کا یہ تھا کہ مالی اعتبار سے بھی طالوت اس منصب کے لائق نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کے اس مباحثہ سے ان کا کردار سامنے آتا ہے ان کا مطالبہ تو یہ تھا کہ ایک بادشاہ مقرر کیا جائے جس کی ماتحتی میں وہ راہِ خدا میں جہاد کریں مگر جب بادشاہ مقرر کر دیا گیا تو سر اکڑ گئے گردنیں تن گئیں۔ اللہ سبحانہٗ کے تقرر کو چیلنج کرنے لگے اور کہنے لگے کہ طالوت بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے نہ وہ کوئی شاہی نسل سے ہے اور نہ اس کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے۔ یہ فکر کی وہ بے راہ روی ہے جو بنی اسرائیل کا مزاج تھا۔

حضرت سموئیل کا بنی اسرائیل کو جواب

۲۴۷۔ پیغمبر نے یہ سُن کر فرمایا کہ اللہ نے طالوت ہی کو تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اسے وسعت دی ہے۔ حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کو بتایا کہ طالوت کیوں بادشاہ بننے کا مستحق ہے اور اللہ سبحانہٗ نے اس کو کیوں مقرر کیا ہے حضرت سموئیل نے پہلا جواب تو یہی دیا ہے کہ طالوت کا یہ تقرر انسانی نہیں بلکہ خدائی ہے ان اللہ اصطفاہ علیکم یعنی اللہ نے حاکمیت کے معاملے میں طالوت کو تم پر بزرگی عطا فرمائی ہے۔ اس میں حاکم ہونے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے اس لیے ہر طرح یہی مناسب و پُر مصالح ہے ایسا کہ تمہارا ذہن ان باریک مصالح تک نہیں پہنچ سکتا۔ توریت میں اس مقام پر ہے کہ "اور سموئیل نے کہا کہ تم اسے دیکھتے ہو جسے اللہ نے مقرر کیا کہ اس کی مانند سارے لوگوں میں ایک بھی نہیں ہے"۔ (سموئیل ۱۰، ۲۴)

دوسرا عقلی جواب یہ دیا کہ تم اپنے معیار سے بھی دیکھ لو۔ تمہارے معیار سے فوج کے سربراہ میں دو چیزیں ہونی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اسے سپہ سالاری کا فن آتا ہو وہ طالوت کو حاصل ہے دوسرے یہ کہ اس میں جسمانی توانائی ہو اس میں بھی طالوت تم سے ممتاز ہے۔ گویا حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کے معترضین اور نکتہ چین سرداروں کی نکتہ چینی کا جواب دینے

Marfat.com

ہوئے فرمایا:

میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری پستی اور بزدلی تمہارے وقتی جوش اور ولولہ کو کبھی پائیدار نہیں رہنے دے گی اور وقت آنے پر تمہاری یہ گرم جوشی برف کی طرح سرد ہو کر رہ جائے گی چنانچہ تم نے اب اسی لیے حیلہ جوئی شروع کر دی۔ تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حکمرانی کا جو معیار تم نے سمجھ لیا ہے یعنی وسعتِ مال اور کثرتِ دولت اور اونچی ذات کا ہونا تو یہ قطعاً غلط اور سرتاسر باطل ہے۔

اللہ سبحانہٗ کے نزدیک حکمران کے اوصاف میں قوتِ علم اور طاقتِ جسم ضروری ہیں کیونکہ یہی دو وصف حسنِ تدبیر، صحتِ فکر اور جرأت و شجاعت کے ضامن ہیں اور ان اوصاف میں طالوت تم سب میں ممتاز ہے۔

۱۵۷۔ اور حکمرانی تمہارے دینے سے کسی کو نہیں مل سکتی۔ اللہ جسے چاہتا ہے حکمرانی عطا فرماتا ہے اللہ اپنی قدرت میں بڑی وسعت والا ہے۔ چونکہ طالوت کی قوم میں پہلے سے سلطنت نہ تھی۔ ان کی نظر میں طالوت سلطنت کے قابل نظر نہ آئے اور بوجہ مال و دولت اپنے آپ کو لائق خیال کیا نبی نے فرمایا کہ سلطنت کسی کا حق نہیں اللہ کی دین ہے سلطنت کی بڑی لیاقت عقل اور بدن میں طاقت ہے جس میں طالوت تم سب سے افضل ہے۔

دراصل حضرت سموایل نے بنی اسرائیل کو اپنے جواب میں بتایا کہ طالوت کا تقرر اللہ نے چار باتوں کی وجہ سے کیا ہے۔ اوّل استعدادِ فکری، دوم وسعتِ علم، سوم صحت اور جسم کی توانائی، چہارم اللہ کی توفیق۔ تین باتوں کو پہلے بیان فرمایا ہے۔ اب اس میں چوتھی بات کو بیان کیا جا رہا ہے اور اسے علیحدہ اس کی اہمیت کے پیش نظر پیش کیا گیا ہے اور چونکہ پہلی تین باتوں کا تعلق آدمی کے ان اوصاف سے ہے جن کی بنا پر اس منصب کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ توفیق بندہ کے اوصاف میں سے نہیں اور نہ بندہ کو اپنی محنت و کوشش کو اس میں دخل ہے اس لیے اسے علیحدہ اور مستقل عنوان سے بیان فرمایا۔

اللہ کی مشیت اور اسباب

اس سے یہ لطیف نکتہ معلوم ہوا کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے

تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس عالم طبیعت میں اللہ بلا سبب اور بغیر قانون کرتا ہے۔ یہاں جو کچھ بننا کچھ اور جیسا کچھ ہو رہا ہے اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ اللہ جب کسی کو اپنے قانون اور اپنی سنت کے مطابق بادشاہ بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس میں استعداد فراہم کرتا ہے اور بعد ازیں اس کی کوشش کے لیے اسباب فراہم کرتا ہے گویا بیک وقت دو باتیں جمع ہوتی ہیں ایک اس کی ذات میں دوسری اس کی ذات سے باہر لوگوں میں۔

عام زبانوں پر مشہور حدیث کما تکونون یولی علیکم میں اس طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ جیسے تم ہو گے ویسے ہی تم پر حکمران ہوں گے الدرالمنتثرہ فی الاحادیث المشتہرہ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث ابن جمیع نے معجم میں بحوالہ ابوبکر اور بیہقی نے شعب الایمان میں بحوالہ یونس بن اسحاق آئی ہے لیکن حدیث منقطع ہے۔ ایسے مواقع پر لوگوں کو ان آیتوں سے شبہ ہو جاتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دیتا۔ اس لیے وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ ہی ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوتے ہے حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے لیے ان میں کوئی ارادہ، کوئی طلب کوئی خواہش نہیں ہے۔ اب صرف یہی صورت ہے کہ اللہ ان کو زبردستی مسلمان بنانا چاہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر بنانا اللہ کے جاری قانون کے خلاف ہے۔

بہرحال اس فقرے میں بتایا گیا ہے کہ اقتدار و اختیار اللہ کی دین ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جس کو دیتا ہے اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت دیتا ہے۔ اس کا اقتدار سب کے اقتداروں کو محیط اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں ـــــ اللہ سبحانہٗ نے طالوت کے تقرر پر ان کے اعتراض کا تین طرح سے جواب دیا ہے اوّل یہ کہ بادشاہ ہونے کے سبب حقیقی اللہ کا تقرر ہے اور یہ نسبی قابلیت سے بالکل بے نیاز ہے یعنی اس کے یہاں تقرر نسب ناموں سے نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ ہونے کے اسباب طالوت میں موجود ہیں، علم کی وسعت، جسم کی صحت و توانائی اس کے لیے ضروری ہے۔ مال و دولت کی کثرت کوئی معیار نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ و رسول کے فیصلہ کے بعد اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے نہیں اس فیصلے کے سامنے بلا چون و چرا سرنگوں ہو جانا چاہیے

قرآن اور معیارِ استحقاقِ منصب

قرآن کی اس آیت نے اس ذہن کی قطعی طور پر تردید کر دی جس میں اقوام دنیا مبتلا ہیں کہ

Marfat.com

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ
مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ
الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾ رکوع ۳۲ ۱۶

اور اُن سے اُن کے پیغمبر نے کہا کہ طالوت کے اللہ کی جانب سے مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے مقدس تابوت تمہارے پاس واپس آئے گا[۱۶]۔ اس تابوت میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لیے دلجمی کا سامان ہے[۱۷] اور جو کچھ موسیٰ اور ہارون کے گھرانے اپنی مقدس یادگاریں چھوڑ گئے ہیں اُن کا بقیہ ہے[۱۸] اور جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اگر تم مومن ہو تو اس واقعے میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے۔

قیادت وحکومت صرف اسی شخص کا حق ہے جو دولت وثروت کا مالک اور سرمایہ داری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو اور حسب ونسب میں بھی بلند مرتبہ ہو۔ اقوامِ دُنیا کا حکومت کے بارے میں یہ تصور اس درجہ عام رہا ہے کہ جو قومیں تہذیب وتمدن اور علم ودانش کی علمبردار رہی ہیں وہ بھی اس معاملہ میں جاہلیت کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ اسلام نے اس جاہلی نظریہ پر یہاں ضرب کاری لگائی اور واضح کیا ہے کہ اللہ کے نزدیک حکومت وامامت، قیادت وخلافت کا تعلق ــــ

۱۔ نہ دولت وثروت سے وابستہ ہے۔

Marfat.com

۲۔ نہ حسب و نسب اس کے لیے کارآمد ہے۔
۳۔ نہ یہ چیز وراثت میں منتقل ہوتی ہے۔
امام ابوبکر الجصاص احکام القرآن نے اس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے اور خوب کیا ہے، فرماتے ہیں:

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کے نزدیک خلافت و حکومت میں وراثت نہیں ہے اور یہ بھی اس سے ثابت ہے کہ امامت کے استحقاق میں نسب کو بھی دخل نہیں ہے۔

بلکہ منصب کا مدار علم اور صحت پر ہے کیونکہ حق و انصاف حسن تدبیر اصابت رائے جو حکومت وزارت کے لیے بنیادی شرط ہے وہ مال و دولت، حسب و نسب سے پیدا نہیں ہوتی۔

طالوت کے تقرر کی غیبی نشانی

بنی اسرائیل نے جب یہ سنا تو اپنے پیغمبر سے کہا کہ طالوت کے تقرر کی اور بھی کوئی دلیل ہونی چاہیے تاکہ ہمیں کوئی شبہ نہ رہے۔ ذاتِ نبوت نے دعا فرمائی اور طالوت کے تقرر کی نشانی بتادی۔[1]

گویا بنی اسرائیل کی رد و کد نے بات کو اتنا طول دے دیا کہ انہوں نے حضرت سموئیل سے یہ مطالبہ ہی کر دیا کہ اگر طالوت کا تقرر من جانب اللہ ہے تو اس کے لیے اللہ کا کوئی نشان دکھائیے۔ حضرت سموئیل نے فرمایا کہ اگر تمہیں اللہ کے اس فیصلہ کی تصدیق منظور ہے تو اتمامِ حجت کے لیے وہ بھی تم کو عطا کر دی جاتی ہے اور وہ یہ کہ جو متبرک صندوق تابوت سکینہ تمہارے ہاتھوں سے چھن گیا ہے وہ طالوت کی بدولت تمہارے پاس واپس آئے گا اور حکمتِ الٰہی سے ایسا ہوگا کہ تمہاری دیکھتی آنکھوں آئے گا۔ فلسطینیوں سے بنی اسرائیل کی مرعوبیت ان کے ہاتھوں ان کے قتلِ عام اور خدا کے صندوق چھن جانے کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

فلسطی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خوں ریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار پیادے وہاں کھیت آئے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ (سموئیل باب ۴، ۱۰، ۱۱)

خدا کے صندوق کے چھن جانے کا جو اثر بنی اسرائیل پر ہوا اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔ اس خبر لانے والے نے جواب دیا اسرائیلی فلستیوں کے آگے سے بھاگے اور لوگوں میں بڑی خونریزی ہوئی اور تیرے دونوں بیٹے حفنی اور فینحاس بھی مر گئے۔ اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا تو وہ کُرسی پر سے پچھاڑ کھا کے گر پڑا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی ——— اور کہنے لگی کہ اسرائیل کی حشمت جاتی رہی اس لیے کہ خدا کا صندوق چھن گیا تھا اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے سو اُس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے۔ (سموئیل باب ۴، ۱۷-۲۲)

اس آیت میں اسی چھنے ہوئے صندوق کی واپسی کو طالوت کے تقرر کے لیے ایک نشان قرار دیا گیا ہے۔ تابوت کی واپسی کیسے ہوئی؟ اس کا جواب آپ کو اس آیت کے تشریحی نوٹ میں ملے گا۔

تابوت سکینہ

۷۱۶ ۔ اور اُن سے اُن کے پیغمبر نے کہا طالوت کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے مقدس تابوت تمہارے پاس آئے گا۔ بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا۔ اس میں تبرکات تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیائے بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے تھے۔ اللہ اس کی برکت سے فتح دیتا۔ جب جالوت اُن پر غالب آیا تو یہ صندوق بھی وہ لے گیا۔ جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچنا نامنظور ہوا تو یہ کیا کہ جہاں صندوق کو رکھتے وہیں وبا اور بلا آتی۔ پانچ شہر ویران ہو گئے۔ ناچار ہو کر دو بیلوں پر لاد کر ہانک دیا۔ فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے۔ بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر یقین لائے اور طالوت نے جالوت پر فوج کشی کی اور موسم نہایت گرم تھا۔[1]

تابوت کا خاص اصطلاحی نام تابوت سکینہ ہے۔ یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملی و قومی

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

ورثہ تھا۔ اس کے اندر اصل نسخہ تورات مع تبرکات انبیاء محفوظ تھا۔ اسرائیلی اس کو بڑی برکت اور تقدیس کی چیز سمجھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے۔ سفر و حضر، جنگ و امن ہر حال میں اسے بڑی حفاظت سے اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ موجودہ علماء یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش حسب ذیل تھی۔

طول ۲½ عرض ۱½ بلندی ۱½ فٹ۔ بنی اسرائیل اپنی ساری خوش بختی اسی سے وابستہ سمجھتے تھے۔ مدت ہوئی فلسطینی اسے ان سے چھین لے گئے تھے۔ اسرائیلی اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست و بدطالعی سمجھ کر اس کی واپسی کے لیے حد درجہ بیتاب تھے۔ طالوت کے وقت میں یہ تابوت آنے کے بعد تاریخ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں حضرت سلیمان ۹۳۲ ق م مسیح تک رہا اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسی میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال ہے کہ یہ تابوت اب بھی ہیکل سلیمان کی بنیادوں کے اندر دفن ہے۔

چونکہ اس دور میں بنی اسرائیل کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس تابوت کو اپنے دشمنوں سے واپس لینے کا تھا اسی بنا پر حضرت سموئیل نے طالوت کے خدائی تقرر کے لیے یہ نشانی ٹھہرائی کہ اس کے بعد تابوت تمہارے پاس فرشتوں کی مدد سے آجائے گا۔ چنانچہ ان کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور فلسطینیوں نے اس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر اس کو بنی اسرائیلی کے علاقہ میں ہانک دیا۔ تابوت کی اس گاڑی کا بغیر کسی گاڑی بان اور بغیر کسی محافظ اور وہ بھی دو ایسی گایوں کے ذریعے جن کے دودھ پیتے بچے گھروں میں روک لیے گئے تھے اس طرح بغیر دائیں بائیں مڑے ٹھیک منزل پر پہنچ جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو فرشتوں کی رہنمائی اور مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔ قرآن نے تحمله الملائکة سے اسی طرف اشارہ کیا ہے [1]

قرآن اور توریت کے بیان میں فرق

اس باب میں بائبل کا بیان قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے۔ قرآن کی زیر بحث آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی واپسی کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب طالوت کا خدا کے مقرر کردہ

---

[1] تدبر قرآن

Marfat.com

بادشاہ کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اور یہ واقعہ گویا ایک نشان تھا۔ اس بات کا کہ طالوت کا تقرر اللہ کی جانب سے ہے۔

اس کے بالکل برعکس تورات کا بیان یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے ہی تابوت کو ایک گاڑی میں رکھ کر اسرائیل کے علاقہ کی طرف ہانک دی تھی۔ اس طرح تورات میں اس کی واپسی کا پس منظر یہ ہوتا ہے کہ فلسطینوں کے لیے تابوت مصیبت بن گیا تھا۔ اس سے تنگ آ کر انہوں نے صندوق روانہ کر دیا۔

میرے خیال میں دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ واقعہ کوئی راز نہیں۔ اس کی پشت پر ایک تاریخ ہے۔ اسرائیلیوں کو اس رد و کد اور بحث و مناظرہ میں وقت لگانا پڑا۔ اللہ سبحانہٗ کے سارے معاملات تکوینی ہوتے ہیں۔ اور اللہ نے اس مقررہ وقت پر اس کام کے ہونے کے لیے عالمِ غیب میں خبر نہیں کتنے زمانہ پہلے سے حالات میں سازگاری شروع فرمائی ہوگی۔ احوال و ظروف جب اس ڈھب پر آ گئے کہ ان کے ظہور کی عملی گھڑی آ گئی تو انہوں نے اس صندوق کو اس سکیم کے مطابق واپس کر دیا۔ اس سارے کام کے لیے سات ماہ کا عرصہ کوئی عرصہ نہیں ہے۔

۷۱۷۔ اس تابوت میں تمہارے لیے دلجمعی کا سامان ہے۔ اصل ارشاد میں سکینۃ آیا ہے سکینۃ سکون سے فعیلہ کے وزن پر ہے۔ اس کے معنے سکون، طمانیت اور وقار کے ہیں۔ فیہ سکینۃ کا مطلب یہ ہے کہ تابوت تمہارے لیے طالوت کے معاملہ میں سکونِ قلب کا سامان ہے۔ اور سکون کے نتیجے میں اب تمہارا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ چونکہ صندوق بغیر کاری بان کے فرشتوں کی رہنمائی سے آیا تھا اس لیے اس سے دلوں کی بے چینی ختم ہو گئی۔ قرآن میں اس کو کبھی تثبیت کہا جاتا ہے اور کبھی سکینت۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں نزولِ ملائکہ کو نزولِ سکینت فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت براء بن عازب کے حوالہ سے آیا ہے کہ:

> ایک شخص زمانۂ نبوت میں سورۂ کہف تلاوت کر رہا تھا رات کا وقت تھا۔ پاس ہی اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ بدلی اٹھی اور چکر کاٹنے لگی۔ کبھی کبھار قریب آ جاتی گھوڑا بدکنے لگا۔ صبح ہونے پر وہ شخص جناب رسالتمآب میں حاضر ہوا۔ اور رات کا پورا واقعہ سنا دیا۔ حضور نے فرمایا قرآن کے لیے سکینت نازل ہوئی۔ الفاظ یہ

Marfat.com

ہیں۔ تلک السکینۃ تنزلت للقرآن
ایک دوسری حدیث میں ہے کہ
اسید بن الحضیر قرآن تلاوت کر رہے تھے، رات کا وقت تھا اور یہی واقعہ پیش آیا حضور
نے فرمایا کہ فرشتے تیرا قرآن سن رہے تھے۔
ایک موقعہ پر فرشتوں کو سکینت کہنا اور دوسرے موقعہ پر ان کو فرشتہ اس بات کی دلیل ہے
کہ فرشتوں کا نزول اللہ کی جانب سے دلجمعی کا سامان ہوتا ہے۔ یہاں فرشتوں کی رہنمائی میں
صندوق کا آنا بنی اسرائیل کی دلجمعی کا سامان بن گیا۔ اور شائد تابوت کے سامانِ سکینت بننے
کی وجہ یہ بھی ہو کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔
۷۱۸۔ اور جو کچھ موسیٰ اور ہارون کے گھرانے اپنی مقدس یادگاریں چھوڑ گئے ہیں۔
اُن کا بقیہ ہے۔ یعنی اس صندوق میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات
تھے۔ ان تبرکات کا تمہیں مل جانا صد ہزار خیرات و برکات کا موجب ہوگا۔ تبرکات سے مقصود
پتھر کی وہ تختیاں ہیں جو طورِ سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ
تورات کا اصل نسخہ بھی اس میں موجود تھا جسے حضرت موسیٰ نے خود لکھوا کر نبی لاوی کے سپرد
کیا تھا۔ نیز ایک بوتل میں من بھی رکھ دیا تھا تاکہ آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد
کریں جو صحرا میں اس نے ان کے باپ پر کیا تھا اور غالباً حضرت موسیٰ کا وہ عصا بھی تھا جو اللہ
کے عظیم الشان معجزات کا مظہر تھا۔[1]

ایک شبہ کا ازالہ

اس کے بعد قرآن میں یہ فقرہ ہے کہ تحملہ الملائکۃ فرشتے اس تابوت کو اٹھائے ہوئے
تھے۔ عام مفسرین قرآن نے اس کا مطلب وہی بتایا ہے جو حضرت شیخ الہند نے اپنے افادات
میں اختیار فرمایا ہے کہ فرشتوں کی رہنمائی میں گائیوں کی گاڑی اسرائیلی علاقہ میں آگئی۔ ان گائیوں
کا رُخ خاص اسرائیلی علاقہ کی جانب کر دینا بھی فرشتوں کا کام تھا اور طالوت کی تائید میں
غیبی نشان تھا۔ چنانچہ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ ساقتھا الملائکۃ الی طالوت گاڑی کی گائیوں کو

---

[1] تفہیم القرآن

Marfat.com

طالوت کی طرف ملائکہ نے ہانکا۔ ابن کثیر نے امام سفیان ثوری کے اساتذہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اس کو ایک گاڑی کے ذریعے فرشتے لے کر آئے۔ محمود آلوسی رقمطراز ہیں۔ اللہ نے اس گاڑی پر چار فرشتے مقرر فرما دیے جو گاڑی کو ہانک کر طالوت کے گھر لے آئے۔ یہی بات قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنی تفسیر میں فرمائی ہے۔ عبدالوہاب نجار نے بھی قصص القرآن میں یہی لکھا ہے کہ فرشتوں کی رہنمائی میں اس طرح یہ گائیں صندوق کی گاڑی کو بغیر کسی قائد و سائق کے منزل مقصود پر لے آئیں۔

حیرت ہے کہ مولانا حفظ الرحمان کو یہ مطلب باطل اور نظم قرآنی کے خلاف نظر آیا۔ اس کی وجہ خود انہوں نے یہ بتائی ہے کہ

اس لیے کہ قرآن عزیز کے بیان کا حاصل تو یہ ہے کہ تابوت سکینہ کی واپسی طالوت کی حکمرانی کے لیے خدا کا ایک نشان ہے۔ مگر تورات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاڑی میں جوتی گئی گائیں بیت شمس کی سڑک پر لے جاکر چھوڑ دی گئیں۔ البتہ انہوں نے دائیں بائیں رُخ نہ کیا اور سیدھی چلتی رہیں یہاں تک کہ بیت شمس کے سامنے کھیتوں میں جا کھڑی ہوئیں ——— تابوت کے حاصل ہونے کا یہ طریقہ بے شبہ معجزہ یا نشان کی حیثیت نہیں رکھتا۔

مولانا نے شاید غور نہیں کیا کہ تابوت کے آنے کو طالوت کے حکمران ہونے کے لیے آیۃ قرار دیا گیا ہے۔ تابوت کی آمدی کیفیت کو قرآن نے طالوت کی حکمرانی کے لیے آیت قرار نہیں دیا۔ تابوت کی گاڑی کا بغیر کسی گاڑی بان اور بغیر کسی محافظ کے اور وہ بھی دو ایسی گایوں کے ذریعے جن کے دُودھ پیتے بچے گھروں پر روک لیے گئے۔ اس طرح بغیر دائیں بائیں مڑے ٹھیک منزل پر پہنچ جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو کروبیوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے اسی چیز کو قرآن نے تحملہ الملائکہ سے تعبیر کیا ہے۔

ہاں بائبل میں تابوت سکینہ کی واپسی عہد طالوت سے بہت پہلے بتائی گئی ہے۔ قرآن نے یہاں یہ تصریح کر کے حسب معمول بائبل کے بیان کی تصحیح کر دی۔ کیونکہ اولاً بائبل میں جہاں فلستیوں کے اس تابوت کو لے جانے اور پھر واپس آنے کا ذکر ہے وہاں سے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے۔ چنانچہ پادری ڈملو کی تفسیر بائبل میں اس کا صاف اعتراف موجود ہے۔

ثانیاً، سموئیل کی دونوں کتابوں کے متعلق یہ علم ہے کہ یہ خود کوئی تاریخی حیثیت نہیں

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ
بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ
فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ
اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ
قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ
الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ
غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو بولے کہ اللہ تمہارا امتحان ایک دریا[۷۱۹] کے ذریعے لینا چاہتا ہے لہٰذا یاد رکھو جو شخص اس کا پانی پیئے گا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے اور میرا ساتھی وہ ہے جو اس کا مزہ بھی نہ چکھے، ہاں اگر کوئی مجبوری کی حالت میں اپنے ہاتھ سے ایک چلّو لے لے اور پی لے تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں ہے[۷۲۰] لیکن جب لشکر دریا پر پہنچا تو ایک تھوڑی تعداد کے سوا سب نے پی لیا۔ پھر جب طالوت اور اُس کے ساتھ وہ لوگ جو ایمان رکھتے

Marfat.com

دریا پار ہوئے تو ان لوگوں نے جنہوں نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی کہا ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کی سکت نہیں ہے[۲۱] لیکن وہ لوگ جن کو اللہ سے ملنے کی یقین کی دولت حاصل تھی پکار اُٹھے کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے[۲۲]

رکھتی ہیں بلکہ ان کا ماخذ کوئی اور ابتدائی تحریر ہے۔ اور پھر تابوت کا ذکر سموئیل کے پانچویں چھٹے باب میں ایسے بے ربط طریق پر ہے کہ پادری ڈلو اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ تابوت کا ذکر جو پانچویں چھٹے باب میں ہے اس سے اس بات کا پتہ نہیں ملتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے سوائے اس کے کہ یہ جنگ افیک کے بعد کا ہے۔ چھٹے باب کی پہلی آیت میں لکھا ہے کہ صندوق سات مہینوں تک فلستیوں کے ملک میں رہا اور ساتویں باب کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تابوت بیس برس تک قریہ یعاریم میں رہا۔ اور سارے بنی اسرائیل نے خداوند کے لیے نالے کیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہ مغلوب تھے، حالانکہ تابوت کا ان کے درمیان آنا بطور نشان تھا کہ وہ مظفر و منصور ہوں گے لہٰذا یہ واقعات ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ قرآن کا بیان یہاں صحیح ہے کیونکہ اس کی واپسی بنی اسرائیل کی فتح و ظفر کی نشانی تھی اور فلستیوں پر ان کا فتح یاب ہونا طالوت کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔

طالوت کی جنگی تیاری

چونکہ طالوت کے تقرر سے مقصود میدانِ جنگ کی قیادت تھی اس لیے سب سے پہلے اسی مقصد کے حصول کی خاطر طالوت نے بنی اسرائیل کو نفیر عام دیا کہ وہ دشمنوں کے مقابلے میں جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ لیکن جب وہ جنگ کی تیاری کر رہے تھے تو ان کی کمان میں ایسی قوم آئی تھی

Marfat.com

جو ایک طرف دشمن سے شکست خوردہ قوم تھی اور مقابلہ ایک غالب قوت سے تھا۔ دوسری طرف طالوت کے تقرر کو پہلے مشکوک نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ان دو باتوں کی وجہ سے آغاز ہی میں ان کو آزما لینا ضروری تھا تاکہ پتہ لگ جائے کہ کون شخص تعمیلِ حکم، ضبطِ نفس اور صداقت و اخلاص کا حامل ہے اور کس میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تاکہ ادائے فرض سے پہلے ہی ایسے عناصر کو الگ کر دیا جائے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم فلسطیوں کے مقابلہ کے لیے تھی جن کا سردار جاتی جولیت تھا جس کا ذکر قرآن نے جالوت کے نام سے کیا ہے اس جنگ میں طالوت اور جالوت کی فوجوں کے ایک دوسرے کے بالمقابل فوج آرائی کی جو شکل بیان ہوئی ہے وہ بالکل اس شکل سے ملتی ہے جو ہمارے ہاں بدر کے موقعہ پر کفار اور مسلمانوں کے مابین پیش آئی۔ سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے:

> پھر فلستیوں نے جنگ کے لیے اپنی فوجیں جمع کیں اور یہودا کے شہر شوکہ میں فراہم ہوئے۔ شوکہ اور عزیقہ کے درمیان افدلہم میں خیمہ زن ہوئے۔ سادل اور اسرائیل کے لوگوں نے جمع ہو کر ایلہ کی وادی میں ڈیرے ڈالے اور لڑائی کے لیے فلستیوں کے مقابل صف آرائی کی، اور ایک طرف کے پہاڑ پر فلستی اور دوسری طرف کے پہاڑ پر بنی اسرائیل کھڑے ہوئے اور ان دونوں کے درمیان وادی تھی۔
>
> (سموئیل باب ۱۷ ۱-۳)

اس نقشہ پر غور کیجئے اور پھر ایک نظر اس نقشہ پر ڈالیے جو بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے آمنے سامنے ہونے کا بیان ہوا ہے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ بالکل جنگِ بدر کی تصویر ہے۔ صحیح بخاری کی کتاب المغازی میں حضرت براء ابن عازب کا یہ بیان اس کی تائید کرتا ہے کہ ہم اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحابِ بدر کی تعداد اصحابِ طالوت کے برابر ہے۔ گویا جنگِ بدر کے پیش آنے سے پہلے قرآن نے اس کا نقشہ طالوت کی جنگ میں دکھا دیا تھا۔

فوج کی آزمائش

۷۱۹۔ پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو بولے کہ اللہ تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعے لینا چاہتا ہے۔ ہوس سے طالوت کے ساتھ چلنے کو سب تیار ہو گئے۔ طالوت

Marfat.com

نے کہہ دیا کہ جو کوئی جوان زور آور ہو اور بے فکر ہو وہ چلے ایسے بھی اسی ہزار نکلے۔ پھر طالوت نے ان کو آزمانا چاہا۔ ایک منزل میں پانی نہ ملا۔ دوسری منزل میں ایک نہر ملی۔ طالوت نے حکم دیا کہ جو ایک چلو سے زیادہ پانی پیئے گا وہ میری ساتھ نہ رہے۔ صرف تین سو تیرہ آدمی ان کے ساتھ رہ گئے اور سب جدا ہو گئے۔ جنہوں نے ایک چلو سے زیادہ نہ پیا ان کی پیاس بجھی اور جنہوں نے زیادہ پیا ان کو اور زیادہ پیاس لگی اور آگے نہ چل سکے[1]

مطلب یہ کہ آمنا سامنا ہونے سے پہلے طالوت نے اپنی فوج کے ڈسپلن اور ان کی اطاعت و وفاداری کا امتحان لینے کے لیے یہ اعلان کیا کہ سامنے جو فلاں نہر ہماری راہ میں آرہی ہے اس کے ذریعے سے اللہ تمہارا امتحان کرے گا تم میں سے جو اس کا پانی پی لے گا وہ میرا ساتھی نہ بن سکے گا۔ جو اس کو بالکل نہ پیئے گا وہ میرا ساتھی ہوگا۔ اگر کسی نے ہاتھ سے ایک آدھ چلو پی لیا تو وہ قابلِ درگزر ہے۔ اس امتحان میں اکثریت ناکام ہو گئی۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے[2]

یہ نہر کون سی ہے

نہر کے معنے ندی نالے کے نہیں بلکہ دریا کے ہیں۔ دریا سے یہاں مراد دریائے یردن ہے۔ یہ دریا بڑا نہیں۔ براہِ راست لمبائی ۶۵ میل ہے۔ البتہ پیچ و خم ملا کر کوئی ۲۰۰ میل کی ہے۔ علاقہ فلسطین میں اہم ترین دریا یہی ہے اور گویا ملک کی قدرتی سرحد کا کام دیتا ہے۔ یردن کے اس پار اور اس پار علاقوں کی تقسیم توریت میں درج ہے (یوشع ۱-۱۴-۱۵) اس کا بہاؤ شمال سے جنوب کی طرف ہے۔ یہ بحرِ جلیل اور بحرِ طبریہ ہوتا ہوا بحرِ مردہ میں گرتا ہے اس کا پانی شروع میں تو صاف اور شفاف ہے لیکن آگے چل کر گدلا بدبودار ہے[3]

آزمائش کیوں لی گئی

سنتِ الٰہی یہی ہے کہ تقرر کے موقعہ پر جو اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہیں تقرر کے بعد ان کا امتحان لیا جاتا ہے تاکہ وفاداری کا عملی مظاہرہ ہو جائے۔ آدم کی خلافت پر فرشتوں

---

[1] افاداتِ شیخ الہندؒ [2] تدبر قرآن [3] ماجدی

نے سوال کیا تھا تو حضرت آدم کو خلیفہ بنانے کے بعد ملائکہ کی وفاداری کا مظاہرہ کرنے کے لیے آدم کو مسجودِ ملائکہ بنایا۔ حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسف پر رشک کیا تو حکومت کے بعد یوسف کے لیے بھائیوں کا امتحان یوسف کو مسجودِ برادران بنا کر لیا۔ یہاں اسرائیلیوں کو اوّل وہلہ میں طالوت کی قیادت سے اختلاف تھا اس لیے حکومت وقیادت ملنے کے بعد سب سے ان کی وفاداری اور طاعت گزاری کا امتحان لیا گیا تاکہ کھرے کھوٹے کا پتہ لگ جائے۔

اور اس کی وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ

ایسے مواقع پر لوگوں کا ہجوم عام ہو جاتا ہے اور ان میں کار آمد اور موقعہ پر کام آنے والے کم ہوتے ہیں۔ جوش میں سب ہی قدم اٹھا دیتے ہیں مگر وقت پر ہوش والے تھوڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جوش اور ہوش والوں میں امتیاز کرنا مقصود تھا۔ اس کا یہ امتحان مقرر کیا گیا کیونکہ جنگ میں ضرورت استقلال، جفاکشی اور ہوشمندی کی ہوتی ہے۔ شدتِ پیاس کے وقت بے منت پانی ملنے پر ضبط کرنا استقلال اور جذبات پر قابو پانے کی علامت ہے اور والہانہ پانی پر گر جانا عدمِ استقلال اور سرتاسر جذباتی ہونے کی نشانی ہے[1]

۲۰۷۔ یاد رکھو جو شخص اس کا پانی پیئے گا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے اور میرا ساتھی وہی ہے جو اس کا مزہ بھی نہ چکھے ہاں اگر کوئی مجبوری کی حالت میں اپنے ہاتھ سے ایک چلو لے کر پی لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لَیْسَ مِنِّیْ کا مطلب

اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں یہ ترجمہ ہے لَیْسَ مِنِّیْ کا یعنی میرے ہمراہیوں اور رفیقوں میں سے نہیں ہے۔ یہ معنے نہیں کہ وہ سرے سے ایمان ہی سے خارج ہو گیا۔ کیونکہ یہ گناہ ہے اور گناہ خواہ کتنا سنگین ہو۔ اس کا مرتکب کافر نہیں ہوتا ہے اور شاید یہی ظاہر کرنے کے لیے اندازِ تعبیر یہ اختیار فرمایا کہ لَیْسَ مِنِّیْ میرے سے نہیں یعنی میرا ساتھی اور رفیق نہیں ہے۔ احادیث میں بعض اعمال کی نسبت لیس منی اور بعض کی نسبت لَیْسَ مِنَّا آیا ہے مثلاً "النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ نکاح میری سنّت ہے پس جو شخص میری

---

[1] معارف القرآن م ش

Marfat.com

سنّت سے روگرداں ہوگا وہ مجھ سے نہیں ہے اور ایک حدیث میں ہے من حمل علینا السلاح فلیس منّا جو شخص ہمارے خلاف تلوار اُٹھائے وہ ہم سے نہیں ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ لیس منّا میں جمع کا صیغہ ہے جس سے مقصود اُمّت ہے اور لیس منی میں اپنی ذاتِ خاص کا ذکر ہے جس سے مقصود ترکِ سنّت ہے۔ پس جن احادیث میں لیس منّا کی وعید آئی ہے ان سے مقصود یہی ہوگا کہ ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ یہ ایک پیرایہ وعید ہے جو حضور انورؐ ان مواقع پر بولتے جہاں صریح و قطعی کفر کی جگہ کفر سے بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت ہی بعید حالت کا بتانا مقصود ہوتا تھا اور جن حدیثوں میں لیس منی آیا ہے ان سے مقصود صرف ترک اتباعِ سنّت و اُسوۂ نبوّت ہے۔ بہرحال اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ شخص دائرۂ ایمان سے نکل گیا ہے۔

چُلّو بھر پانی میں کوئی مضائقہ نہیں

موسم گرمی کا تھا اور طالوت کے فوجیوں کو ضرور پیاس لگی ہوگی۔ اس لیے اصل حکم تو پرچۂ امتحان میں یہی تھا کہ کوئی شخص راستہ میں یہ پانی زبان پر نہ رکھے اور یہ دوسرا حکم بطورِ رُخصت تھا کہ ایک آدھ چُلّو سے مُنہ تر کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ گویا سو فی صدی امتحان میں کامیابی کی شرط تو یہی تھی کہ اس دریا کا پانی کوئی نہ چکھے لیکن چلّو پی لینے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اور باقی کی قید اس لیے لگادی کہ مبادا یہ اجازت بُک، لپ، گلاس، کٹورے تک نوبت پہنچا دے۔ لکھا ہے کہ جن لوگوں نے چُلّو بھر پانی پی لیا اُن کی پیاس بجھ گئی اور اُن کے دل قوی ہو گئے اور جن لوگوں نے زیادہ پیا وہ نہ صرف بزدل ہو گئے بلکہ اُن کی پیاس بھڑک اُٹھی۔

فوجیوں کی باہمی گفتگو

۲۴۹۔ پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ وہ لوگ جو ایمان رکھتے تھے دریا پار ہوئے تو جن لوگوں نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی کہا کہ ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے۔ یہ فوجیوں کی آپس میں گفتگو تھی۔ دُشمن کی کثرتِ تعداد اور اس کا عظیم سامان دیکھ کر اس کی ہیبت دل میں بیٹھ جانا اور اپنی طرف سے مایوس ہو جانا ایک امرِ طبعی تھا۔ اچھوں اچھوں کی ہمت بھی ایسے موقع پر طبعی طور پر چھوٹ جاتی ہے۔ یہ بات اُن کے ہی مُنہ سے

Marfat.com

نکلی ہوگی جو پانی پی کر سیراب ہو چکے تھے اور قرینہ کہتا ہے کہ انہوں نے دریا پار کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی ہوگی بلکہ دریا کے اسی کنارے کھڑے کھڑے پار جانے والوں سے کہا کہ ہم میں جالوت سے ٹکر لینے کی ہرگز ہمت نہیں ہے۔

جالوت فلسطینوں کے لشکر کا مشہور سردار، بڑا قدآور پہلوان تھا۔ گویا انسان نما دیوزاد تھا۔ توریت میں اس کی جسامت، قد و قامت، شہ زوری، اس کا سامانِ جنگ اور اس کی میدانِ جنگ میں مقابلہ کی داستان کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اسرائیلیوں نے اس کا یہ سامان دیکھا تو سہم اُٹھے۔ خود توریت کی روایت ہے کہ جس وقت طالوت اور سارے بنی اسرائیل نے اس فلسطی کی بات سُنی تو ان کی دلاوری نکل گئی اور وہ ڈر گئے۔ (سموئیل ۱۷-۱۱)

فتح و شکست کا مدار

۲۴۷۔ لیکن وہ لوگ جن کو اللہ سے ملنے کا یقین ہے پکار اُٹھے کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب لشکر دریا پار کر گیا تو جن لوگوں نے ضبطِ نفس اور اطاعتِ امیر کا ثبوت دیا تھا انہوں نے بے خوف ہو کر کہا کہ ہم ضرور دشمن کا مقابلہ کریں گے کیونکہ اللہ کی قدرت کا یہ مظاہرہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آتی رہتی ہیں اور بڑی جماعتیں چھوٹی جماعتوں سے شکست کھاتی رہتی ہیں۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی کثرت و قلت پر نہیں بلکہ ایمان باللہ اور اخلاص پر ہے اور اللہ کی مدد انہی کا ساتھ دیتی ہے جو مومن مخلص ہوں اور ثابت قدم ہوں۔

اربابِ عزیمت کا چہرہ

ایمان تو سب کے پاس تھا مگر ان اربابِ عزیمت کا چہرہ اللہ نے اس عنوان سے پیش فرمایا الذین یظنون انھم ملاقوا اللہ جن کو اللہ کی ملاقات کا یقین ہے۔ اس خاص صفت سے ان کے تعارف کرانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقی شجاعت جو موت کو اللہ کی راہ میں زندگی سے بھی زیادہ عزیز بنا دیتی ہے وہ مومن کے اس یقین سے پیدا ہوتی ہے کہ اللہ کی راہ میں مرنے والے مرتے نہیں ہیں بلکہ حقیقی زندگی اور اپنے رب کی ملاقات سے مشرف ہوتے ہیں — گویا

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾
فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۖ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ
اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ
لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ
الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

اور پھر وہ جب میدان جنگ میں جالوت اور اُس کے لشکر کے سامنے آئے تو انہوں نے کہا خدایا تو دیکھ رہا ہے کہ ہم کمزور ہیں اور تھوڑے ہیں اور مقابلہ اُن سے ہے جو طاقتور ہیں اور بہت ہیں) تو ہم پر صبر کے جام انڈیل دے اور ہمارے قدم میدانِ جنگ میں جما دے اور ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما۔[۲۲۳] چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے حکمِ الٰہی سے دُشمنوں کو شکست دی[۲۲۴] اور داؤد کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا، پھر اللہ نے داؤد کو بادشاہی اور حکومت سے سرفراز کیا۔ اور اس کو وہ سب کچھ سکھلا دیا جن کی حکمرانی و دانشوری کی خاطر سکھانے کی اس کی مشیت ہوئی۔[۲۲۵] اور دیکھو اگر اللہ انسانوں کے ایک

Marfat.com

گروہ کے ذریعے دوسرے گروہ کو نہ ہٹاتا تو دُنیا خراب ہو جاتی، لیکن اللہ سب جہانوں کے لیے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔ ۷۲۶ھ

کہہ کر بتا دیا کہ جو لوگ اللہ کی ملاقات پر یقین رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کی مختصر سی جماعت جو مشقتوں اور تکلیفوں سے گزر کر بلندیوں اور رفعتوں تک پہنچتی ہو وہ ہی غالب رہنے والی ہے کیونکہ اس کا تعلق اُس طاقتور ہستی سے ہے جو ساری کائنات پر قدرت رکھنے والی ہے۔ یہ لوگ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ مدد صرف اللہ ہی کی جانب سے آتی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور ان کے ساتھ ہے جن کو اس نے حق و باطل کے معرکہ میں حق کو سربلند کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔

اس طرح مسلمانوں کو اشارتاً سمجھا دیا کہ طالوت کا تقرر بھی اللہ نے کیا تھا اور عالم کی اصلاح کے لیے تمہارا تقرر بھی اللہ نے کیا ہے خواہ پوری دُنیا کی اکثریت تمہارے خلاف ہو مگر تمہیں اس یقین کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے کہ تم اللہ کی جانب سے اصلاح کا فرض ادا کرنے آئے ہو۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی کثرت و قلت نہیں بلکہ ایمان و یقین ہے۔

میدانِ جنگ میں دُعا

سچی دُعا وہ ہے جو سچی استعداد کے ساتھ ہو، طالوت کے ساتھیوں نے اپنی دُعا میں صرف یہ نہیں کہا کہ ہمیں فتح مند کر بلکہ فتح مندی کی طلب سے پہلے صبر و ثبات کی طلب گاری کی اور کہا کہ ہمیں صبر دے اور ہمارے قدم جما دے کیونکہ خدا کی نصرت انہی کے حصہ میں آتی ہے جن میں صبر و ثبات کی رُوح پیدا ہو جاتی ہے۔ اس موقعہ پر یہ دُعائی پیمانہ بتا رہا ہے کہ قرآن کی نگاہ میں دُعا کی کتنی اہمیت ہے۔ یہ کوئی مسجد نہیں، خانقاہ نہیں، میدان جنگ ہے۔ عین میدانِ جنگ میں اہلِ ایمان کا اللہ سے یہ تعلق اس بات کی علامت ہے کہ قرآن کسی موقعہ پر اللہ سے بے نیاز گوارا نہیں کرتا۔ دُعا کی اس کیفیت میں بھی بدر کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں:

Marfat.com

بدر کے دن میں نے لڑائی میں حصہ لیا۔ ذرا واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں پڑے ہوئے فرما رہے ہیں یا حی یا قیوم پھر میں میدان میں آیا اور لڑا، پھر واپس آیا تو حضور کو اسی حال میں پایا۔ (فتح الباری)

سجدے سے سر اٹھایا جاتا ہے، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھے ہوتے ہیں، تن اور بدن کا ہوش باقی نہیں ہے، مونڈھوں سے چادر مبارک گر گئی ہے لیکن کامل انہماک اور استغراق، دل کی ساری قوت و توجہ اصرار اور الحاح کے ساتھ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں:

یا اللہ! آپ کو یاد دلاتا ہوں اپنا عہد اور اپنا وعدہ اے اللہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی بندگی نہ ہو اے اللہ اگر یہ مٹھی بھر اسلام کے نام لیواؤں کی جماعت تباہ ہوگی تو تیری زمین میں بندگی نہ ہوگی۔ (بخاری و مسلم)

وعدہ کے باوجود اللہ اور اللہ کی نصرت کو جس بے قراری سے آج ڈھونڈھا جا رہا ہے کہ بقول حضرت عبداللہ بن مسعود ہم نے کسی گم شدہ چیز کے طالب کو تلاش و جستجو میں ایسا نہیں سنا جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اللہ کی مدد کو تلاش کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے دعا بھی ایک تدبیر ہے۔

آدابِ جنگ کی تعلیم

۲۵۰ - اور پھر جب وہ میدانِ جنگ میں جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے آئے تو انہوں نے کہا خدایا تو ہم پر صبر کے جام انڈیل دے اور ہمارے قدم میدانِ جنگ میں جما دے اور ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما۔ سامنے آئے ترجمہ ہے برزوا کا۔ براز کھلے میدان کو کہتے ہیں اور برز کے معنے کھلے میدان میں آجانا۔ بعض دفعہ کسی شخص کی چھپی ہوئی حالت کے ظاہر ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب طالوت اور اس کی فوجوں کا جالوت اور اس کے لشکر سے آمنا سامنا ہوگیا جیسے قرآن نے بدر کا نقشہ جنگ بتاتے ہوئے یہ تعبیر اختیار کی ہے فلما تراءت الفئتان جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا۔ یعنی فوجیں ایک دوسرے کے سامنے میدان میں صف بستہ ہوگئیں۔ اور مڈبھیڑ ہونے کو تھی کہ طالوت اور اس کی فوجوں نے سب سے پہلا کام جو کیا یہ اور صرف یہ تھا کہ اسباب سے ہٹ کر خالقِ اسباب کی طرف متوجہ ہوگئے اور عقلی تدبیر یعنی امتحان کے بعد کامیابی کی اس کلیدی تدبیر کو اپنایا جسے دعا کہتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں

بہترین موقعہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں میں ترتیب، سامانِ جنگ کی استطاعت کے مطابق بہم رسانی۔ تیر کب چلائے جائیں، تلوار کب استعمال ہو، پتھروں اور ڈھیلوں سے دُشمن پر کب حملہ ہو، ان میں سے ہر بات کی تکمیل کے بعد طالوت اور اس کے فوجیوں نے عالم غیب کی طرف اپنے کو متوجہ کیا اور سراپا اخلاصِ مجسم ہو کر پُرنم آنکھوں کے ساتھ اللہ کی جناب میں دُعا کی۔

اس طرح قرآن نے اپنے مخاطبوں کو آدابِ جنگ کی تعلیم دی ہے کہ ایمان و اسلام کے علمبرداروں کا تکیہ قوت و شوکت پر نہیں بلکہ نصرتِ الٰہی پر ہوتا ہے۔ قرآن اور توریت کے بیانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ توریت میں نفس جنگ کے خشک واقعات کی تفصیل قرآن سے کہیں زیادہ ہے اور وہ اسی پر قانع ہے کہ گویا توریت کوئی تاریخ و تذکرے کی کتاب ہے برخلاف اس کے قرآن ہر موقعہ پر اصولِ دین، اخلاقِ عالیہ کی تعلیم دیتا ہے اور یہی اس نے یہاں کیا ہے کہ میدانِ جنگ کے تمام واقعات میں سے خاص طور پر اور عنوان بنا کر دُعا کا ذکر کیا ہے۔ افرغ علینا صبراً ہم پر صبر کے جام انڈیل دے یا ہم پر صبر کو پانی کی طرح بہا دے کہ سر سے پیروں تک صبر کے پانی میں نہا جائیں اور صبر کی برودت اور سکینت ہمارے ظاہر و باطن میں سرایت کر جائے۔ ثبت اقدامنا ہمیں ثبات قدمی عطا فرما کہ کسی حال میں بھی پیچھے نہ ہٹیں۔ ثباتِ قلب اور ثباتِ قدم کے بعد کافروں پر غلبہ کی درخواست پیش کی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ثابت قلبی اور ثابت قدمی کا شائد قدرتی طور پر نتیجہ غلبہ ہی ہو جاتا لیکن اُن عارفین کی نظر اپنے سارے انتظامات اور ساری سعی سے بڑھ کر تائیدِ الٰہی پر مرکوز تھی اس لیے صراحت کے ساتھ غلبہ کی دُعا بھی ان کی زبانی نقل کی گئی۔

اس دُعائی پیمانے کی لطافت قابلِ شنید ہے۔

اوّلاً: دُعا میں ربوبیت کو بطورِ وسیلہ پیش کیا ہے جس کا حاصل ادنیٰ سے ادنیٰ تر مقام سے اٹھا کر آہستہ آہستہ درجہ کمال تک پہنچا دینا ہے۔

ثانیاً: لفظِ افراغ لا کر صبر کی بہتات اور فراوانی کی درخواست کی ہے اور اس لفظ میں لطیف اشارہ ہے کہ اے اللہ ہمیں کام و دہن کی تشنگی دُور کرنے کے لیے دریا کے پانی کی ضرورت نہیں ہمیں تو اپنے دلوں اور سینوں کی ٹھنڈک کے لیے صبر کا پانی درکار ہے۔ کیونکہ افراغ کے معنے بہانے کے آتے ہیں۔

ثالثاً: دُعا میں لفظ علیٰ لائے ہیں جس کے معنے اوپر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صبر ایسا عطا کر

Marfat.com

جو ہم پر چھا جائے۔

رابعاً: لفظِ صبر کو تفخیم اور شان کی برتری کے لیے نکرہ لائے ہیں یعنی عظیم الشان صبر سے ہمیں مالا مال کر۔

خامساً: صبر کے لیے افراغ کا لفظ بولا ہے جس کے معنے بہانے کے ہیں اور اس موقعہ پر گویا دُعا مانگنے والوں پر کیفیت طاری ہوگئی کہ صبر کا پانی آرہا ہے۔ اس احساس سے یہ اندیشہ ہوا کہ اس میں قدم نہ پھسل جائیں اس لیے افراغ کی مناسبت سے فرمایا کہ ہمارے قدم جمائے رکھنا۔

سادساً: اس دُعا میں حسنِ طلب کے ساتھ حسنِ ترتیب کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ پہلے صبر، پھر ثباتِ قدم اور پھر دُشمن پر غلبہ۔

۷۲۴۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے حکمِ الٰہی سے دُشمنوں کو شکست دی۔ یعنی طالوت کے لشکر نے جالوت کے لشکر کو شکست فاش دی۔ اذن آیت میں حکمِ الٰہی اور توفیق کے معنے میں ہے۔ فھزموھم۔ حرف فا فصیحہ ہے یعنی چونکہ طالوت اور اس کی فوج نے جنابِ الٰہی میں دُعا کی تھی اس لیے اللہ نے ان کی دُعا قبول فرمائی اور دُعا کی قبولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے اُن کو جمعیتِ قلب ثباتِ قدم کی نعمت عطا فرمائی اور اپنی خاص نصرت کے ذریعے اُن کو غلبہ مرحمت فرمایا۔

توریت نے فلسطیوں کی اس شکست کو اس طرح پیش کیا ہے:

اور فلسطیوں نے جو دیکھا کہ اُن کا پہلوان مارا پڑا تو وہ بھاگ نکلے اور اسرائیل اور یہودا کے لوگ اُٹھے اور للکارے اور فلسطیوں کو وادی تک عقرون کے پھاٹک تک رگیدا اور فلسطیوں میں سے جو زخمی ہوئے سو یفریم کی راہ میں جات اور عقرون تک کنارے گرے تھے تب بنی اسرائیل فلسطیوں کو رگیدے پھرے اور اُن کے خیموں کو لوٹا۔

(سموئیل ۱۷-۵۲)

۷۲۵۔ اور داؤد کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا۔ پھر اللہ نے داؤد کو بادشاہی اور حکومت سے سرفراز کیا اور اس کو وہ سب کچھ سکھایا جس کی حکمرانی و دانشوری کی خاطر سکھانے کی اس کی مشیت ہوئی۔ اس جنگ میں حضرت داؤد کے والد اور اُن کے چھ بھائی اور خود حضرت داؤد بھی شریک تھے حضرت داؤد کو راہ میں تین پتھر ملے اور بولے اٹھائے ہم کو ہم جالوت کو قتل کریں گے۔ جب مقابلہ ہوا، جالوت خود باہر نکلا اور کہا کہ میں اکیلا تم سب کو کافی ہوں میرے سامنے آتے جاؤ۔ حضرت سموئیل نے حضرت داؤد کے والد کو بلایا کہ اپنے بیٹے مجھ کو دکھاؤ۔ اُس نے چھ بیٹے جو قد آور تھے دکھائے

Marfat.com

لیکن حضرت داؤد کو نہیں دکھایا ان کا قد چھوٹا تھا اور بکریاں چراتے تھے۔ پیغمبر نے اُن کو بلوایا اور دریافت کیا کہ تم جالوت کو مارو گے انہوں نے فرمایا کہ ضرور ماروں گا۔ پھر جالوت کے سامنے گئے اور اور ان ہی تین پتھروں کو فلاخن میں رکھ کر مارا۔ جالوت کا صرف ماتھا کھلا تھا اور تمام بدن لوہے میں غرق تھا۔ تینوں پتھر اس کے ماتھے پر مارے اور پیچھے کو نکل گئے۔ جالوت کا لشکر بھاگا اور اسرائیلیوں کو فتح ہوئی۔ پھر طالوت نے داؤد سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی اور طالوت کے بعد یہ بادشاہ ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکم جہاد ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور اس میں اللہ کی بڑی رحمت ہے[1]

حضرت داؤد کا چہرہ

داؤد بن یسی ابن عوبید ایک پیغمبر برحق ہوئے۔ ان کا زمانہ ۱۰۲۴ تا ۹۹۳ ق م ہے۔ قرآن میں آپ کا ذکر ۱۶ مقام پر آیا ہے۔ طالوت کی فوج میں صرف ایک نوجوان سپاہی کی حیثیت سے شامل تھے۔ اس وقت تک نہ نبوت سے سرفراز ہوئے تھے اور نہ ملک و سلطنت سے۔ ان کی ابتدا غریبانہ لیکن انتہا نہایت شاندار تھی۔

طالوت کی فوج میں ان کی شمولیت کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ایک سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس جنگ کے پیش آنے سے پہلے ہی طالوت کے سلاح بردار تھے۔ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل وقت کے وقت اپنی بکریاں چراگاہ میں چھوڑ کر اپنے بڑے بھائیوں کو جو جنگ میں شریک تھے اپنے باپ کے حکم سے کچھ چیزیں دینے آئے تھے۔ یہاں میدان جنگ تیار تھا اور جالوت مقابلہ کے لیے للکار رہا تھا لیکن کسی میں ہمت نہ ہو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُن کو جوش آیا اور اس کے مقابلہ کے لیے خود کو پیش کر دیا۔ یہ اس وقت بالکل نوخیز سُرخ رو اور خوش قامت نوجوان تھے۔ طالوت کو ان کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اجازت دینے میں تردد تھا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ میں اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے شیروں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں بھلا اس نامختون فلسطینی کی کیا حیثیت ہے؟ تو طالوت نے ان کے عزم و ہمت کو دیکھ کر اجازت دے دی۔ چرواہوں کی طرح اپنی فلاخن اٹھائی، چادر کے ایک کونے میں کچھ پتھر رکھے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

اور وقت کے سب سے بڑے دیو کے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ حضرت داؤد نے فلاخن میں رکھ کر پتھر مارا۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اتنے بڑے سپہ سالار کا ایک اَن ٹرینڈ شہری کے فلاخن سے ڈھیر ہوجانا ظاہر ہے کہ ایک عظیم واقعہ تھا۔

قرآن نے اس داستان سرائی سے بچ کر کام کی بات فرمائی ہے کہ قتل داؤد جالوت جالوت کو داؤد نے مار ڈالا۔ اس کے بعد قرآن نے حضرت داؤد کا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ واتاہ اللہ الملک اللہ نے داؤد کو بادشاہی دی۔ قرآن نے یہاں صاف کہہ دیا کہ یہ بادشاہی خدائی عطیہ تھی یہ فرمانروائی بنی اسرائیل کو ملی۔ حضرت داؤد نسلِ اسرائیل کے دوسرے بادشاہ ہیں۔ تاجدارِ اوّل طالوت تھے۔ آپ انہی کے داماد تھے۔ طالوت جب مع اپنے بڑے فرزند کے میدانِ جنگ میں کام آگئے تو قبیلہ یہودا نے ان کو اپنا بادشاہ مقرر کیا اور دو سال کی کشمکش کے بعد باقی قبیلوں نے بھی آپ پر اتفاق کرلیا۔ سات سال تک آپ نے اپنا پایہ تخت حبرون یعنی الخلیل کو رکھا۔ اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے نکال کر اسے دارالسلطنت بنایا۔ آپ نے اپنے گرد و پیش کے حکمرانوں کو مغلوب و مسخر کیا اور اپنے حدودِ سلطنت بنایا۔ آپ کا عہدِ حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحاتِ ملکی اور حسنِ انتظام دونوں کے لیے یادگار ہے۔ ابھی قرآن کا پیش کردہ داؤدی چہرہ ختم نہیں ہوا ہے آگے ارشاد ہے کہ اللہ نے داؤد کو حکمت دی۔ اور ان تمام چیزوں کو تعلیم دی جو اللہ نے چاہا۔ یعنی حکمرانی اور دانشوری کی باتوں میں سے اللہ نے جو کچھ سکھلانا چاہا سکھا دیا۔ شارحینِ قرآن نے یہاں حکمت سے مراد نبوت لی ہے اور کچھ اس کا مصداق زبور کو بتاتے ہیں۔ دونوں درست یعنی علومِ نبوت کا ان کو وہ خزانہ ملا جس کا مظہر زبور ہے۔ دراصل بادشاہی میں جب حکمت نبوت کی پیوندکاری ہو تو اسی کا نام خلافت ہے اور اگر حکمت نبوت بادشاہ کی رہنما نہ ہو تو یہ بادشاہت چنگیزی ہے۔ نبی ہوکر بادشاہ ہونا اللہ کو پسند ہے۔ گویا بادشاہی اور فقیری کا یہی امتزاج اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ آخری بات اس سلسلے کی یہ ہے کہ علمہ مما یشاء اللہ نے جو کچھ چاہا ان کو سکھا دیا چونکہ علومِ انبیاء کو ناپنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے اس لیے فرمایا کہ اللہ نے جو کچھ چاہا سکھا دیا۔ اس کے عموم میں وہ تمام علوم و فنون و صنائع جو حضرت داؤد کو اللہ نے سکھائے تھے آگئے۔ حضرت داؤد پر تفصیلی اور سیر حاصل مباحث انشاء اللہ پارہ ۲۲ اور ۲۳ میں آئیں گے۔

حق و باطل کی معرکہ آرائی دائمی ہے

۲۶۷ ۔ اور دیکھو اگر اللہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعے دوسرے گروہ کو نہ ہٹاتا تو دنیا خراب

Marfat.com

ہو جاتی۔ لیکن اللہ سب جہانوں کے لیے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کا نظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک خاص حد تک تو زمین میں غلبہ و طاقت حاصل کرنے دیتا ہے۔ مگر جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے تو کسی دوسرے گروہ کے ذریعے سے وہ اس کا زور توڑ دیتا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک قوم اور ایک پارٹی ہی کا اقتدار زمین میں ہمیشہ کے لیے رکھا جاتا اور اس کی قہرمانی لازوال ہوتی تو یقیناً ملکِ خدا میں فسادِ عظیم برپا ہو جاتا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہوتے ہیں یہ یونہی خواہ مخواہ بلا ضرورت نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ بامقصد و پُرحکمت ہی ہوتے ہیں اور اس طریق کار سے ظلم و عصیان اور طغیان کی اصلاح مدِنظر ہوتی ہے۔[2]

اس قرآنی آیت نے یہ بات کھول کر بتا دی اور علم الاجتماع کا یہ مسئلہ واضح کر دیا کہ اگر قوموں اور جماعتوں کی باہمی کشمکش نہ ہوتی اور ہر جماعت اپنی اپنی حالت میں بغیر منازعت کے چھوڑ دی جاتی تو نتیجہ یہ نکلتا کہ دُنیا ظلم و فساد سے بھر جاتی اور حق و عدالت کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ پس یہ اللہ کا بڑا ہی فضل ہے کہ جب کبھی ایک گروہ ظلم و فساد میں چھوٹ ہو جاتا ہے تو مزاحمت کے محرکات دوسرے گروہ کو مدافعت کے لیے کھڑا کر دیتے ہیں اور ایک قوم کا ظلم دوسری قوم کی مقاومت سے دفع ہوتا رہتا ہے۔[3]

مسئلہ دفاع کی طرف توجہ کی وجہ

یہاں خاص طور پر اس مسئلہ دفاع کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور خاص طور پر اس کی حکمت مصلحت کیوں بیان کی گئی ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں مذہب کے راہبانہ تصور نے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات اتار دی تھی کہ آخرت کی نجات و فلاح کے لیے صرف اوراد و وظائف اور انسانوں کے نیازمندانہ اعمال کافی ہیں۔ جنگ اور اللہ کے دین کو برتر کرنے اور مظلوموں کو ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کوئی محسوس قدم اٹھانا دینداری کے خلاف ہے۔ اس آیت میں اہلِ ایمان کو سمجھایا گیا ہے کہ ایمانی زندگی

---

[1] تفہیم القرآن [2] ماجدی [3] ترجمان القرآن

Marfat.com

اسی عمل کے بقاء پر موقوف ہے، جب تک اہلِ ایمان میں یہ جذبہ باقی رہے گا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال قربان کرنے کے لیے تیار رہے گا اس وقت دُنیا کی کوئی قوت ان پر غالب نہ آسکے گی۔ جس روز یہ جذبہ مُردہ ہو جائے گا اسی دن سے اہلِ ایمان کی ایمانی موت بھی شروع ہو جائے گی۔ قرآن نے یہاں پہلے مثال میں اسرائیل کی تاریخ سے دو واقعے پیش کیے ہیں اور بتایا ہے کہ جب تک اسرائیل میں اعتقاداً و عملاً یہ جذبہ باقی رہا، اقتدار و حکومت ان کے گھر کی کنیز تھی اور جب چند گھڑیوں کے عیش و راحت کا عشق ایمانی زندگی کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آگیا اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے تو ذلت و محکومی کا داغ ہر اسرائیلی کی پیشانی پر لگ گیا۔ یہاں قرآن نے کھول کر بتا دیا ہے کہ اسلام کے دُنیا میں قیام کی اور اہلِ ایمان کے پوری دُنیا میں اُمتِ وسط بننے کی اصل بنیاد یہی ہے اس لیے سارے عملوں اور نیکیوں سے جو ایک مسلمان دُنیا میں کر سکتا ہے اس عمل کا مرتبہ و اجر افضل و اعلیٰ ہے۔ جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہو گی، اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب ہو گا۔ یہاں حضرت داؤد کا کارنامہ بیان کرتے ہوئے صرف اس کردار کی نمائش کی ہے کہ قتل داؤد جالوت اور اس کے علاوہ کوئی بات نہیں فرمائی جبکہ دوسرے موقعہ پر قرآن نے حضرت داؤد کے بارے میں یہ انکشاف کیا کہ وہ تسبیح و تہلیل کی شخصیت تھی۔

وسخرنا مع داؤد الجبال یسبحن والطیر

ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے لیے مسخر کر دیا وہ اللہ کی پاکی کی صدائیں بلند کرتے تھے اور اسی طرح پرندوں کو بھی۔

یعنی جب حضرت داؤد حمدِ الٰہی کے نغمے گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔ چٹانیں اور پرندے تک وجد میں آجاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمانی زندگی میں صرف تسبیحات تہلیلات ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایمان کی خاطر سرفروشی کی بھی ضرورت ہے اور اس کے لیے کوئی خاص وقت اور خاص عہد نہیں، ہر حال اور ہر زمانے میں ایک مومن و مسلم کی زندگی میں ایمان و صداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق و ولولہ ہے۔ یہی مسنامِ دین ہے۔ یہی عمادِ ملت ہے یہی اساسِ شریعت ہے، یہی ملاکِ اسلام ہے یہی ایمان و نفاق کی اصلی کسوٹی ہے۔ نماز اسی کی خاطر ہے، روزہ اسی کی خاطر ہے، حج اسی کے لیے ہے، زکوٰۃ اسی کے لیے ہے۔ سب اس کے لیے ملتوی ہو سکتے ہیں اس کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ نماز دین کا ستون ہے اور

Marfat.com

روزہ بُرائیوں سے بچنے کی ڈھال ہے لیکن جہاد دین کی بنیاد ہے اور بُرائیوں کو معدوم کرنے والی قوت ہے۔ اس کی فضیلت کو کوئی عمل نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اس کی دائمی محبوبیت سے سرفراز کرے۔ ہزاروں نمازیں اور ہزاروں روزے بھی اس ایک قطرۂ خون کے گردِ پا کو نہیں پا سکتے۔ جو اس راہ میں کام آیا اور عمر بھر کے صدقات وخیرات بھی اس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جو اس راہ میں خرچ کیا گیا۔ یہی عمل ایمان واسلام کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

مقامِ عبرت

آج جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری نمازیں اور دُعائیں، ہمارے اوراد و وظائف اور ہماری ریاضتیں اُخروی نجات و فلاح کے لیے کافی ہیں ان کو غور کرنا چاہیے کہ جب صحابہ کرام کو ان کی نمازوں، عبادتوں اور اعمالِ صالحہ کے باوجود یہاں قرآن یہ سمجھا رہا ہے کہ ایمان کی برتری اور دفعِ مظالم کے لیے جہاد ضروری ہے کہ مبادا اسلام کی سربلندی اور دینِ حق کے غلبہ کی کوشش میں ان کے قدم سُست پڑ جائیں تو ہم لوگوں کی عبادتیں کس شمار میں ہیں جبکہ ہم اللہ کے دین کو سربلند کرنے اور اسلام کو دُنیا پر غالب کرنے کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ قربانی دینے کو بھی تیار نہیں ہیں یہاں تک کہ ہمارے دل بھی اس آرزو سے خالی ہیں کہ اللہ کی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اُس کے عطا کیے ہوئے قانونِ سعادت اور ضابطۂ حیات کا بول بالا ہو فاما للہ والی اللہ المشتکی

غور فرمائیے کہ مخاطبت کن لوگوں سے کی جا رہی ہے اور کیا کہا جا رہا ہے؟ ان سے جن کو کہا گیا ہے:-

کذالک جعلنکم اُمۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس

ہم نے تمہیں نیک ترین اُمت بنایا تاکہ تم ساری انسانیت کے سامنے فرضِ شہادت ادا کرو

اور پھر اُن سے کہا گیا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین

اے اہلِ ایمان صبر و نماز کی قوت سے سہارا لو یقین کرو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان ہی کے سامنے صابرین کی مثال پیش کر کے کہا جا رہا ہے کہ:

Marfat.com

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ

وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

اے اللہ کے رسول جو کچھ بیان کیا گیا ہے اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اور ہمارا پیش کرنا برحق ہے یقیناً آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اپنی پیغامبری کے لیے چن لیا ہے ۔[۲۷۲]

۱۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی قلت و کثرت پر نہیں بلکہ ایمان کی قوت اور صبر و ثبات پر ہے۔
۲۔ ایمان باللہ میدانِ مقابلہ میں جمنے اور ڈٹنے کے لیے سب سے بڑا سبب ہے ۔
۳۔ میدان جنگ میں اللہ کی جناب میں دعا کرنا، رونا اور آہ و زاری کرنا فتح و کامرانی میں مؤثر ہے
۴۔ جنگ انسانی زندگی میں ایک ناگزیر ضرورت ہے اور یہ مظلوموں کا قدرتی حق ہے اگر اس حق سے محروم کر دیے جائیں تو دنیا میں انسانی ظلم و استبداد کی مدافعت کا کوئی سامان باقی نہ رہے گا ۔
۵۔ تم حق کے علمبردار بنو، حق ہی کو باقی رہنا ہے بشرطیکہ تم اس کے لیے محنت کرو گے ۔ باطل کے مقابلہ میں حق، ظلم کے مقابلہ میں عدل، منکر کے مقابلہ میں معروف اور فساد کے مقابلے صلاح کو سربلندی ملتی ہے اگر حق کی خاطر دفاعی قوتیں ظہور میں آجائیں ۔

نبوتِ محمدیہ کی دلیل

تاریخ کے یہ واقعات جو ہم نے آپ کو سنائے ہیں آپ کی زبان سے ان کا منظرِ عام پر آنا ۔

Marfat.com

اس بات کی واضح اور کھلی دلیل ہے کہ آپ بھی انبیاء و رسل کے مبارک سلسلے کی کڑی ہیں۔ ورنہ جس چیز کے جاننے کا آپ کے پاس ذریعہ نہ تھا۔ آپ اسے کیسے بیان کر سکتے تھے اور وہ بھی ایسی صحت کے ساتھ کہ اصل واقعہ تمام غیر فطری ملاوٹوں سے بالکل پاک ہو۔

قرآن کی مختلف سورتوں میں اس کا اظہار ہے کہ اے اللہ کے پیغمبر تمہاری زبان سے آج گزشتہ پیغمبروں، اگلی امتوں کے واقعات ادا ہوتے ہیں۔ ان واقعات سے آگاہی حاصل کرنے کے تین ہی ذریعے انسان کے ہاتھ میں ہیں ایک یہ کہ اس واقعہ کے وقت موجود ہو۔ دوسرا یہ کہ ان حالات کو کتابوں میں پڑھے تیسرا یہ کہ اوروں سے سُنے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اطلاع کے ان تینوں ذرائع سے ناآشنا تھے اوّل ذریعہ تو ظاہر ہے کہ مفقود تھا۔ قرآن حکیم میں آدم سے مولد محمدی تک کے تمام واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ واقعات آپ کی ولادت باسعادت سے پہلے وقوع پذیر ہوئے تھے اور آپ کے پاس ان کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ علم کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ کتابوں کو پڑھ کر اطلاع حاصل ہو۔ قرآن حکیم نے اس کی بھی نفی کی ہے، تیسرا ذریعہ یہ تھا کہ دوسروں سے سُن کر یہ علم حاصل کیا جائے۔ سب کو معلوم ہے کہ نبوت سے پہلے حضور انور کی تمام تر زندگی مکہ معظمہ میں گزری۔ مکہ میں نہ ان واقعات کا کوئی واقف کار تھا اور نہ قریش کو ان سے آگاہی تھی اس لیے یہ ذریعہ علم بھی ثابت نہیں ہے۔ اس کے باوجود آپ اُمّی ہو کر اُمیوں میں جوان ہو کر کتب سابقہ کی ظاہری تعلیم سے ناآشنا ہو کر بھی اگر آپ یہ واقعات پیش کر رہے ہیں تو یہ آپ کا اعجازی کارنامہ ہے جو آپ کے نبی ہونے کی کھلی دلیل ہے۔ کفار کو خطاب کر کے ایک موقعہ پر قرآن نے کہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے لیے کیا یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ ناآشنائے تعلیم ہو کر وہ کچھ جانتے ہیں جس کی بنی اسرائیل کے سوا کسی کو خبر نہیں ہے اولم یکن آیۃ ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل

۲۷ ۔ اے اللہ کے رسول جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اور ہمارا پیش کرنا برحق ہے یقیناً آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اپنی پیغامبری کے لیے چن لیا ہے۔ یہ قصہ جو بنی اسرائیل کا گزرا یعنی ہزاروں کا نکلنا اور ان کا دفعتاً مرنا اور جینا اور طالوت کا بادشاہ ہونا یہ سب اللہ کی آیتیں ہیں جو تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور تم بے شک اللہ کے رسولوں میں سے ہو، یعنی جیسے پہلے پیغمبر ہو چکے

Marfat.com

ہیں ویسے ہی تم بھی یقیناً رسول ہو کیونکہ ان گزشتہ واقعات کو ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہو۔ نہ کسی کتاب میں آپ نے پڑھا اور نہ کسی آدمی سے سنا۔[1] گویا بتا دیا گیا ہے کہ اس سرگزشت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ سرتاسر آیات اللہ ہیں کیونکہ اللہ نے وحی کے ذریعے بتائی ہیں۔ اگر وحیٔ الٰہی کا فیضان نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ان واقعات کا تمہیں علم ہوتا اور دنیا کے آگے تم اس طرح پیش کرتے۔ ظاہر ہے کہ واقعات تم سے ہزاروں سال پہلے کے ہیں اور دنیا میں گزشتہ واقعات کے علم و سماعت کے جتنے وسائل ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی وسیلہ بھی تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ اس لیے بلاشبہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

صداقتِ نبوت کی واضح دلیل

گویا قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ اگر اللہ کی جانب سے آپ پر وحی کا فیضان نہ ہوتا تو آپ یہ واقعات نہ بتلا سکتے کیونکہ آپ کے پاس ان کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ آپ ظاہری تعلیم سے بالکل بیگانہ تھے۔ اگر آپ نے کوئی تعلیم پائی ہوتی تو آپ کے معاصر ساحر کے طرز پر اس کا بھی آپ کو الزام دیتے کہ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ چونکہ یہ بات آپ کے مخالف بھی مانتے تھے کہ آپ نے کبھی کسی کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا۔ اس لیے انہوں نے یہ الزام بھی آپ کو کبھی نہیں دیا۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ ظاہری تعلیم کے عیب سے پاک ہے۔ چنانچہ قرآن نے بآوازِ بلند کہا،

قل لو شاء اللہ ما تلوتہ علیکم ولا ادراکم بہ فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون

کہہ دو کہ اگر اللہ چاہتا تو میں تمہیں قرآن نہ سناتا اور نہ تمہیں اس سے خبردار کرتا۔ دیکھو یہ واقعہ ہے کہ اس سے پہلے تمہارے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

صداقتِ نبوت کی یہ سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل ہے۔ فرمایا کہ میں تم میں نیا آدمی نہیں ہوں جس کے احوال و اخلاق کا تمہیں پتہ نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں اور دعویٰ نبوت

---

[1] لغاداتِ شیخ الہند

Marfat.com

سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمرِ انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہارے سامنے ہے۔ اس تمام مدت میں مجھے کسی سے سیکھتے یا پڑھتے دیکھا۔ اگر تمام عمر میں مَیں نے کسی کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا تو پھر یکایک یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پڑھ جاؤں۔ بلاشبہ میرے پاس اللہ کی وحی آتی ہے اور اگر یہ نہیں تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ خود عقل سے سوچو کہ اگر تمام عمر میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر وحی آتی ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں۔

قرآن نے ان تمام شکوک و شبہات کو دہرایا ہے جو ان کی جانب سے پیش ہوتے، مگر آپ کے مخالفوں نے یہ شبہ کبھی نہیں کیا کہ حضور انور نے چپکے سے پڑھنا سیکھ لیا ہے اور دوسری آسمانی کتابیں پڑھ کر یہ قرآن بنا لیتے ہیں۔ اس سے معلوم تھا کہ آپ کی ظاہری تعلیم نہ ہونے پر ان کو یقین تھا۔

بہر حال یہاں قرآن نے آپ کے نبی ہونے کی مستحکم دلیل یہ پیش کی ہے کہ چونکہ یہ واقعات نہ تم نے ان کی کتابوں میں پڑھے ہیں نہ کسی تاریخ میں دیکھے اور نہ تم کو ان کی خبر ہے۔ پھر جو تم ان کو صحیح بیان کر رہے ہو بجز وحی کے تمہارے پاس کوئی ذریعہ نہیں اور وحیٔ الٰہی کے ذریعہ سے کسی بات کو بیان کرنا یہی پیغمبری ہے۔ اس لیے آپ بھی اللہ کے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر ہیں۔ جنگ کی جو منزل آپ کو پیش آگئی ہے سنتِ الٰہی کا مقتضا یہی تھا کہ ظلم و فساد کی بیخ کنی کرنے اور اللہ کے نام کا بول بالا کرنے کے لیے اس منزل سے گزرنا ناگزیر ہے۔ اس راہ سے جیسے سب رسولوں کو گزرنا پڑا ہے آپ کو بھی گزرنا ہے۔

رب تقبل منی انک انت السمیع العلیم۔

Marfat.com

Marfat.com